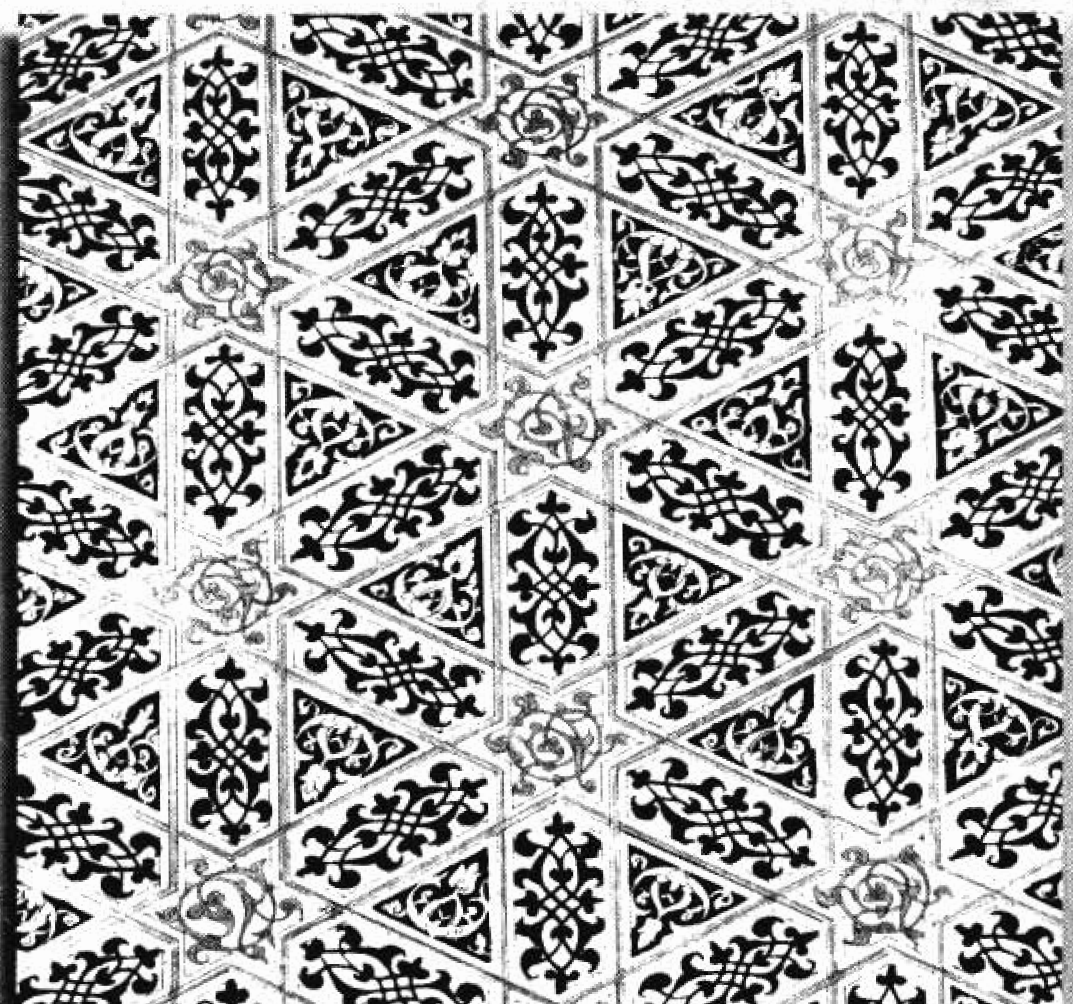
ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

۱۹۹۸

مُدیر
خورشید احمد



اِدارۂ ترجمان القرآن

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مدیر: خرم مراد

عدد ۹ | ستمبر ۱۹۹۴ ربیع الاول ۱۴۱۵ | جلد ۱۲۰

فہرست مضامین

برائے ادارتی امور

منصورہ' ملتان روڈ' لاہور ۵۴۵۷۰' فون نمبر ۸-۷۵۷۰۱۳۴ فیکس (۰۴۲) ۷۵۷۴۷۱۹

برائے انتظامی امور

رحمٰن مارکیٹ' اردو بازار' لاہور ۵۴۰۰۰' فون نمبر ۷۲۳۴۰۱۴-۷۲۳۶۶۶۵' پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ کراس چیک قبول نہیں کیے جائیں گے۔

قیمت فی شمارہ -/۱۰ روپے ○ زر سالانہ: ۱۰۰ روپے (اندرون ملک)

عرب ممالک' خلیجی امارات و برصغیر: ۵۰۰ روپے' یورپ: ۶۰۰ روپے' امریکہ و آسٹریلیا: ۷۰۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عید محمد پرنٹرز' لاہور سے چھپوا کر دفتر' ترجمان القرآن' اچھرہ' لاہور سے شائع کیا۔

ادارۂ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اچھرہ لاہور (پاکستان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ستمبر کے مہینہ میں' آج سے ۱۵ سال قبل' سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس دنیا سے اللہ تعالیٰ کی رحمت کی طرف انتقال فرمایا۔ زندگی بھر اپنے قول و عمل سے وہ ترجمانِ قرآن رہے' اور ایک عرصہ تک "ترجمان القرآن" کے ساتھ یک جان بھی۔ اس موقع کی مناسبت سے ہم نے "اشارات" کے تحت ان کے' آغاز سے لے کر دارالاسلام پٹھانکوٹ کی طرف ہجرت تک کے اشارات کے اقتباسات کو جمع کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان "اشارات" کے ذریعہ قارئین کے سامنے نہ صرف سیّد مودودیؒ کی سیرت کے وہ گوشے نمایاں ہو جائیں گے جن سے وہ عموماً ناواقف ہیں' بلکہ دورِ حاضر کے لیے بھی بیش بہا رہنمائی فراہم ہو گی۔ (خرم مراد)

"ترجمان القرآن" کو میری ادارت میں شائع ہوتے ہوئے ایک سال ہو چکا ہے۔ اس مدت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین اور اپنی کتاب کی خدمت کے لیے جو توفیق مجھ کو عطا فرمائی' اور سخت ہمت شکن حالات میں خدمت کے لیے کمربستہ رہنے کی جو استقامت بخشی' اس کے لیے شکر بجا لانا میرا فرض ہے۔ اگرچہ میرا شکر اس کے فضل و انعام کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ میں نے جن حالات میں اس رسالے کی ادارت سنبھالی تھی' اور بعد میں مسلسل کئی مہینے تک جو مشکلات مجھے پیش آتی رہیں ان سے یقیناً میرے حوصلے پست ہو جاتے' اگر میرا اعتماد خدا کے بجائے دنیوی اسباب اور خود اپنی قوت پر ہوتا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میرا بھروسہ دنیا اور اسباب پر نہیں ہے' بلکہ ہمیشہ خدا تعالیٰ پر رہا ہے' اور خدا کا یہ سچا وعدہ ہے کہ جو اس پر بھروسہ کرکے اس کی راہ میں صبر و استقامت کے ساتھ سعی کرے گا' اس کو آخر کار کامیابی نصیب ہو گی' اور خوف و حزن اس کے پاس نہ پھٹک سکے گا۔

آج کل مسلمانوں کی دماغی روحیں جس طرف جا رہی ہیں' اس کو دیکھتے ہوئے میں سمجھتا

ہوں کہ اس وقت اصطلاحی علوم اور خالص علمی تحقیقات کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی اس امر کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسلیں جو دینی تعلیم سے بے بہرہ جدید تعلیم میں ناپختہ مدرسوں اور کالجوں سے صرف یہ سبق لے کر نکلی ہیں کہ روشن خیالی صرف مذہب میں شک کرنے کا ہی نام ہے' انھیں تعلیمِ قرآنی کے اصل مقصود سے روشناس کرایا جائے' اسلام کے صحیح اصول سمجھائے جائیں' اور ٹھیک انھی قوانینِ عقلی کے مطابق جو بیسویں صدی کے دماغوں کو اپیل کر سکتے ہیں' اسلام اور اس کے عقائد و احکام کو کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ معانی و بیان کی بحثوں' قصص قرآنی کی تاریخ اور جغرافیائی تحقیقات' آیاتِ متشابہات کے معانی کے تعین کے لیے فرصت کے اور بھی بہت سے سامان مل سکتے ہیں۔ یہاں تو خدا کی خدائی' رسول کی رسالت' کتاب کی تنزیل ہی میں شکوک پیدا ہو رہے ہیں۔ دینِ اسلام جن ارکان پر قائم ہے وہی معرضِ بحث میں ہیں۔ ایسی حالت میں زیادہ تر ضرورت نفسِ اسلام کے تحفظ کی ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے "ترجمان القرآن" کا بیشتر حصہ وقف کر دیا گیا ہے۔ (محرم الحرام ۱۳۵۳ھ' ص ۲ - ۷ - ۸ / مارچ ۱۹۳۴ء)

جو لوگ زہر سے متاثر ہیں' ان کو خود اپنے زہر خوردہ ہونے کا احساس ہی نہیں ہے' وہ دوا کی حاجت ہی محسوس نہیں کرتے' بلکہ دوا کے نام سے بھاگتے ہیں۔ ان سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے ذاتی شوق سے اس قسم کا کوئی رسالہ خریدیں گے۔ اوّل اوّل ان کو کہیں غیر معمولی تشویش کے ذریعے سے اس بات پر آمادہ کرنے کی ضرورت ہے کہ کم از کم جانبِ مخالف کا مقدمہ بھی سن لیں' پھر فیصلہ کا انھیں اختیار ہے' جو چاہیں کریں۔

اس رسالے کی ادارت ہاتھ میں لینے سے پہلے میں سمجھتا تھا کہ مسلمان علمِ قرآن کے پیاسے ہیں' قرآن کی دعوت سننے کے لیے ان میں ایک پوشیدہ تڑپ موجود ہے' کمی جو کچھ بھی ہے صرف اس بات کی ہے کہ اس جنس کے پیشِ نظر کرنے والے کمیاب ہیں۔ لیکن گذشتہ ایک سال کے تجربے نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لیے قرآن کے نام میں اتنی کشش بھی نہیں ہے جتنی فلم اشاروں کی تصویروں میں ہے۔ کسی کتاب یا رسالے پر قرآن کا نام آجانا ہی اس کے لیے کافی ہے کہ مسلمان اس سے بھاگیں اور شجرِ ممنوع سمجھ کر اس کو ہاتھ نہ لگائیں۔

افسوس! یہ کیسی مصیبت ہے کہ بیماروں میں اب یہ احساس بھی نہ رہا کہ وہ بیمار ہیں' زخموں

کی بے خبری اس حد کو پہنچ گئی کہ انھیں اپنے زخموں کی بھی خبر نہ رہی' عقل کا فقدان یہاں تک بڑھا کہ دوا سے بھاگتے اور زہر کی طرف لپکتے ہیں' مرہم کو چھوڑ کر نمک اپنے زخموں پر چھڑکتے ہیں' اور امیدوار ہیں کہ اس سے ان کو شفا ہو گی۔

اس شخص کی روحانی اذیت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا جو تفریح کے لیے نہیں' لوگوں کی اصلاح و تعمیر کے لیے اپنا خونِ جگر کھپا کر اپنے دل و دماغ کی ساری قوتیں خرچ کر کے لکھتا ہے' اور پھر اسے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت جن کے فائدے کے لیے اس نے لکھا تھا انھوں نے ہی اس کی طرف توجہ نہ کی' اسے پڑھنے تک کی تکلیف گوارا نہ کی۔

اگر آپ ظلمات کا سفر کر کے بڑی محنتوں اور تکلیفوں کے بعد کسی کو آبِ حیات کا ایک جام لا کر دیں' اور وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے اس کو پھینک کر زہر کا پیالہ اٹھا لے تو غور کیجیے آپ کو کس قدر سخت صدمہ ہو گا۔ بس اسی پر اس صدمہ کو قیاس کر لیجیے' جو ان صفحات کے لکھنے والے کو برداشت کرنا پڑتے ہیں' مگر میں اپنی قوم سے شکایت نہ کروں گا۔ . . وہی مقلب القلوب ہے۔ اسی سے امید ہے کہ مسلمانوں کے دل پھیر لے گا' اور جب ان کے دل پھریں گے تو انشاء اللہ دن بھی پھریں گے۔ (محرم الحرام ۱۳۵۳' ص ۸ تا ۱۰ / مارچ ۱۹۳۴)

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم اب بھی اسلام کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے' اور مسلمان رہنا چاہتا ہے۔ لیکن دماغ مغربی افکار اور مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر اسلام سے منحرف ہو رہے ہیں' اور یہ انحراف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ . . دیکھنے والوں کے لیے مسلمان کی نظر سے دیکھنا اور سوچنے والوں کے لیے اسلامی طریق پر سوچنا مشکل ہو گیا ہے۔ . . اسلام میں ایک نشاۃِ جدید کی ضرورت ہے۔ پرانے اسلامی مفکرین و محققین کا سرمایہ اب کام نہیں دے سکتا۔ دنیا اب بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ . . علم و عمل کے میدان میں رہنمائی وہی کر سکتا ہے' جو دنیا کو آگے کی جانب چلائے نہ کہ پیچھے کی جانب۔ لہٰذا اب اگر اسلام دوبارہ دنیا کا رہنما بن سکتا ہے' تو اس کی بس یہی ایک صورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے محقق اور مفکر پیدا ہوں جو فکر و نظر اور تحقیق و اکتشاف کی قوت سے ان بنیادوں کو ڈھا دیں جن پر مغربی تہذیب کی عمارت قائم ہوئی ہے۔ ملحدانہ نظریہ کو توڑ کر الٰہی نظریہ پر فکر و تحقیق کی اساس قائم کریں' اور اس جدید فکر و تحقیق کی عمارت کو اس قوت کے ساتھ اٹھائیں کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے' اور اس میں مغرب کی مادی تہذیب کے بجائے اسلام کی حقانی تہذیب جلوہ گر ہو۔ (جمادی الاخریٰ ۱۳۵۳' ص ۲۹۰-

(۳۹۱ / اکتوبر ۱۹۳۴)

ربیع الاوّل اور ربیع الثانی کے دونوں مہینے مجھ پر سخت جسمانی تکلیفوں کے ساتھ گزرے۔ ربیع الاوّل کا پرچہ طبیعت پر جبر کر کے حسبِ دستور مرتب کیا' مگر بیماری کی محنت نے دل و دماغ پر ایسا برا اثر کیا کہ ربیع الثانی کے پرچے میں اشارات اور نقد و نظر کے سوا اور کچھ نہ لکھ سکا۔ جو مضامین مسلسل شائع ہو رہے تھے' ان کا سلسلہ مجبوراً توڑنا پڑا . . . میں جانتا ہوں کہ اس سے "ترجمان القرآن" کے ناظرین کو تکلیف ہوئی ہو گی' مگر مجھے امید ہے کہ میری مجبوریوں کی طرف نظر کرتے ہوئے وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ میں امکانی حد تک کوشش کرتا ہوں کہ رسالے کو بہتر سے بہتر مرتب کروں اور مفید مضامین فراہم کروں!

افسوس ہے کہ چند مخلص احباب کے سوا کوئی میری مدد کرنے والا نہیں ہے' ہندوستان کے اہلِ علم جو اعلیٰ معیار کے مضمون لکھ سکتے ہیں' کوئی توجہ نہیں فرماتے' اور دستِ سوال دراز کرنے کی مجھے عادت نہیں' ناچار خود ہی جو کچھ بن پڑتا ہے کرتا ہوں اور جب تک دل و دماغ کی قوتیں ساتھ دیں گی' کیے جاؤں گا۔

جس خدا نے مجھ جیسے ایک عاجز اور حقیر بندے کو اس خدمت پر لگایا ہے' اسی سے امید ہے کہ یا تو مجھے تنہا خدمت بجا لانے کی قوت عطا کرے گا' یا میرے لیے چند مددگار پیدا کر دے گا۔ (جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ھ' ص ۲۹۸ / ستمبر ۱۹۳۴ء)

مسلمان قوم کی حالت اس زمانہ میں ایک بنجر زمین کی سی ہو رہی ہے' جس میں اشجارِ خبیثہ تو خوب بڑھتے اور پھیلتے ہیں' مگر اشجارِ طیبہ کو نشوونما نصیب نہیں ہوتا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے بہت سے خیر و صلاح کے بیج تو زمین میں ہی خاک ہو گئے اور کسی کو تھوڑی بہت بالیدگی حاصل ہوئی بھی تو وہ جڑ نہ پکڑ سکا۔

میں اس حالت سے خود بھی واقف تھا' اور جب میں نے اس کام کو شروع کیا' تو ان لوگوں نے بھی جن کو میری ذاتی فلاح و بہبود سے دلچسپی تھی مجھے نصیحت کی تھی۔

زمین شورہ سنبل بر نیارد   درو تخم عمل ضائع مگردان!

لیکن میرے خیال میں مردِ مسلمان کا کام یہ نہیں ہے کہ زمین کی خرابی' موسم کی ناموافقت' پانی کی کمیابی کو دیکھ کر ہمت ہار بیٹھے۔ اس کے لیے تو ازل سے یہی قسمت کیا گیا ہے کہ بنجر

زمینوں میں ہل چلائے' ان کی شوریدگی کے خلاف جنگ کرے' اپنے پسینے بلکہ ہو سکے تو اپنے خون سے ان کو سیراب کرے' اور نتائج سے بے پروا ہو کر تخم ریزی کیے جائے۔ اگر زمین اس کی کوششوں سے سیر حاصل ہو گئی' تب تو اس کی سرفرازیوں کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ لیکن اگر وہ اس ناکارہ زمین میں تمام عمر محنتِ بے حاصل کرتا رہے' اور آخر ایک روز اسی کام میں جان دے دے' تب بھی وہ حقیقت میں ناکام نہیں ہے۔ اس کے لیے یہی کامیابی کیا کم ہے کہ جس کام کو وہ فرض سمجھتا تھا اس پر اپنی زندگی کی آخری ساعت تک قائم رہا' اور کوئی ناکامی اس کو ادائے فرض سے باز نہ رکھ سکی۔ ایسی ناکامی پر وہ ہزاروں کامیابیاں قربان جو ایک بگڑے ہوئے زمانے کی روش پر چلنے اور اشجارِ خبیثہ کو پرورش کرنے اور ان کے زہریلے ثمرات بیچنے سے حاصل کی جاتی ہیں۔

ان حالات میں جس شخص کو کام کرنا ہو' اس کو تو بدرجۂ اولیٰ صرف خدا کی تائید و نصرت پر بھروسہ کرنا چاہیے' کیوں کہ جس قوم کی بگڑی ہوئی ذہنیت کے خلاف وہ جہاد کر رہا ہے اس سے کسی مدد کی امید نہیں کی جا سکتی' اور اگر چند نیک دل افراد اس کو مل بھی گئے تو محض ان کی تائید کے اعتماد پر کوئی کام نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ ابتدا سے اس رسالے کی روش دیکھ رہے ہیں' انھوں نے خود ہی اندازہ کر لیا ہو گا کہ ادارہ ترجمان القرآن کوئی تجارتی ادارہ نہیں ہے۔ ہمارے پیشِ نظر صرف ایک مقصد ہے' اور وہ مسلمانوں کو قرآن کی طرف دعوت دینا ہے۔ رسالہ کی اشاعت فی نفسہٖ مقصود نہیں بلکہ محض اس دعوت کی اشاعت کے لیے ہے۔ ہر داعی و مبلغ کی طرح ہماری بھی یہ دلی خواہش ہے کہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں تک ہمارا پیغام پہنچے۔ ہمیں خریداروں کی ضرورت نہیں' پڑھنے والوں کی ضرورت ہے۔ اگر ایک رسالہ کو ہزار ہزار آدمی بھی پڑھیں' تو رنج نہ ہو گا' بلکہ مسرت ہو گی۔ اگر ہمارے مضامین اخباروں اور رسالوں میں نقل کیے جائیں تو ہم ان کا شکریہ ادا کریں گے کہ انھوں نے اس دعوت میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ ترجمان القرآن کا ہر خریدار صرف خریدار اور ناظر ہی نہ ہو' بلکہ داعی اور مبلغ بھی ہو۔ ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں میں سے جس قلیل تعداد کو اللہ تعالیٰ نے اس رسالہ کا مطالعہ کرنے کی توفیق عطا کی ہے' اگر وہ مطمئن ہے کہ یہ رسالہ جس راستہ کی طرف بلا رہا ہے وہ سیدھا راستہ ہے' تو اس کو لازم ہے کہ اپنے عزیزوں' دوستوں اور عام برادرانِ دین کو بھی اس کی طرف دعوت دے۔

ادارۂ ترجمان القرآن اور اس کے ناظرین کے درمیان محض بائع اور مشتری کا سا تعلق نہ

ہونا چاہیے۔ ہم اپنے ناظرین میں یہ احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اور وہ ایک ہی مشن کے خادم ہیں۔ وہ اشاعت کی ذمہ داری تنہا ہم پر نہ چھوڑیں' بلکہ خود بھی حتی الوسع اس میں حصہ لیں۔ دل چاہتا ہے کہ ہزاروں پرچے مفت تقسیم کیے جائیں' بلکہ سرے سے اس پرچے کی قیمت ہی لیتے ہوئے ہم کو کراہت محسوس ہوتی ہے' لیکن افسوس ہے کہ ہمارے پاس ایسے ذرائع نہیں ہیں کہ ہم اس پرچے کے تمام مصارف پورے کر کے لوگوں کے چندوں سے بالکل بے نیاز ہو جائیں۔ (محرم الحرام ۱۳۵۴ھ' ص ۳ تا ۵ / مئی ۱۹۳۵ء)

جو غیر مسلم ہیں وہ تو سرے سے جانتے ہی نہیں کہ وہ چشمۂ آبِ حیواں کہاں ہے جو ان کی پیاس بجھا سکتا ہے۔ اور جو مسلمان ہیں وہ اس کو جانتے ہیں' مگر اس کو پیتے نہیں ! اس کے ساقی اصل منبع کو چھوڑ کر ندیوں اور نالوں پر معتکف ہو گئے۔ اس کے دہانے کو جہالت کے پتھروں سے پاٹ دیا گیا۔ اس کے بجائے گندے اور زہریلے پانی کی نہروں کا ایک جال روئے زمین پر پھیل گیا' جس کو بعض نادان اب تک آبِ حیات سمجھ رہے ہیں' اور بہت سے دانا اس مجبوری سے پیئے جا رہے ہیں کہ ان کو آبِ حیات کا پتا معلوم نہیں۔ ایسی حالت میں ایک دو نہیں' بہت سے ایسے منادیوں کی ضرورت ہے جو اطراف و اکنافِ عالم میں خدا کے بھٹکے ہوئے بندوں کو اس چشمے کی طرف بلائیں' جس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کی سیرابی کے لیے چھوڑ گئے ہیں' اور صرف بلانے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ جو درماندگان اس راہ تک آنے کی قوت نہیں رکھتے' ان کے پاس خود اس کا پانی لے کر پہنچ جائیں۔

مشرق ہو یا مغرب' مسلمان ہوں یا غیر مسلم' بلا استثنا سب ایک ہی مصیبت میں گرفتار ہیں' اور وہ یہ ہے کہ ان پر ایک ایسی تہذیب مسلط ہو گئی ہے' جس نے سراسر مادیت کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ اس کی حکمتِ نظری اور حکمتِ عملی دونوں کی عمارت غلط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اس کا فلسفہ' اس کا سائنس' اس کے اخلاق ' اس کی معیشت' اس کی معاشرت ' اس کی سیاست' اس کے قوانین' غرض اس کی ہر چیز ایک غلط نقطۂ آغاز سے چل کر ایک غلط رخ پر ترقی کرتی چلی گئی ہے' اور اب اس مرحلہ پر پہنچ چکی ہے' جہاں سے ہلاکت کی آخری منزل قریب نظر آرہی ہے۔

یہ وقت ہے کہ مغربی قوتوں کے سامنے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو پیش کیا جائے' اور انھیں بتایا جائے کہ یہ ہے وہ مطلوب جس کی طلب میں تمہاری روحیں بے قرار

ہیں' یہ ہے وہ امرت رس جس کے پیاسے ہو' یہ ہے وہ شجرِ طیب جس کی اصل بھی صالح ہے اور شاخیں بھی صالح' جس کے پھول خوشبودار بھی ہیں اور بے خار بھی' جس کے پھل میٹھے بھی ہیں اور جان بخش بھی' جس کی ہوا لطیف بھی ہے او روح پرور بھی۔ یہاں تم کو حکمت ملے گی۔ یہاں تم کو فکر و نظر کے لیے ایک صحیح نقطہء آغاز ملے گا۔ یہاں تم کو وہ علم ملے گا جو نظری اور عملی دونوں قسم کے علوم کو ایک مستقیم و محکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یہاں تم کو وہ ایمان ملے گا جو انسانی سیرت کی بہترین تشکیل کرتا ہے۔ یہاں تم کو وہ روحانیت ملے گی جو راہبوں اور سنیاسیوں کے لیے نہیں بلکہ کارزارِ دنیا میں جدوجہد کرنے والوں کے لیے سکونِ قلب اور جمعیتِ خاطر کا سرچشمہ ہے۔ یہاں تم کو اخلاق اور قانون کے بلند اور پائیدار قواعد ملیں گے' جو انسانی فطرت کے علم پر مبنی ہیں۔ یہاں تم کو تہذیب و تمدن کے وہ صحیح اصول ملیں گے جو طبقات کے جعلی امتیازات اور اقوام کی وضعی تفریقوں کو مٹا کر خالص بنیادوں پر انسانی جمعیت کی تنظیم کرتے ہیں۔

اگر تم ہلاکت سے بچنا چاہتے ہو تو قبل اس کے کہ تمہاری تہذیب ایک ہولناک صدمہ سے پاش پاش ہو کر تاریخ کی برباد شدہ تہذیبوں میں ایک اور کا اضافہ کرے' تم کو چاہیے کہ اسلام کے خلاف ان تمام تعصبات کو جو تمہیں قرونِ وسطیٰ کے مذہبی دیوانوں سے وراثتاً ملے ہیں' اپنے دلوں سے نکال ڈالو' اور کھلے دل کے ساتھ قرآن اور محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو سنو' سمجھو اور قبول کرو۔

مسلمان قوموں کا حال مغربی قوموں کے حال سے مختلف ہے۔ مرض اور ہے اور اسبابِ مرض بھی دوسرے ہیں۔ مگر علاج ان کا بھی وہی ہے جو اہلِ مغرب کا ہے۔ یعنی اس علم و ہدایت کی طرف رجوع' جس کو اللہ نے اپنی آخری کتاب اور اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔

مسلمان صدیوں تک دنیا میں قلم اور تلوار کے ساتھ فرمانروائی کرتے کرتے آخر کار تھک گئے۔ ان کی روحِ جہاد سرد پڑ گئی' قوتِ اجتہاد شل ہو گئی۔ جس کتاب نے ان کو علم کی روشنی اور عمل کی طاقت بخشی تھی' اس کو انھوں نے محض ایک متبرک یادگار بنا کر غلافوں میں لپیٹ دیا۔ جس ہادیِ اعظم کی سنت نے ان کی تہذیب کو ایک مکمل فکری و عملی نظام میں متشکل کیا تھا' اس کی پیروی کو انھوں نے چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ترقی کی رفتار رک گئی۔ بہتا ہوا دریا یکایک جمود کی وادی میں ٹھہر کر تالاب بن گیا' امامت کے منصب سے مسلمان معزول ہوئے۔ جہاد اور اجتہاد کا جھنڈا جس کو مسلمانوں نے پھینک دیا تھا' مغربی قوموں نے اٹھا لیا اور مسلمان سوتے رہے۔ اور اہلِ مغرب اس جھنڈے کو لے کر علم و عمل کے میدان میں آگے بڑھے' یہاں تک

کہ امامت کا منصب ان کو مل گیا۔ آخر صدیوں کی نیند کے بعد جب مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں تو انھوں نے دیکھا کہ میدان ہاتھ سے نکل چکا ہے' دوسرے اس پر قابض ہو چکے ہیں' اب علم ہے تو ان کا ہے' تہذیب ہے تو ان کی ہے' قانون ہے تو ان کا ہے' حکومت ہے تو ان کی ہے! مسلمانوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک شمع رہ گئی ہے' سو وہ بھی خموش ہے۔

ہم اس حالت کو دیکھ رہے ہیں' اور اس کا خوفناک انجام ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اگرچہ رہنمائی کے لیے جس علم و فضل اور جامعیت کی ضرورت ہے' وہ ہم کو حاصل نہیں۔ نہ اتنی قوت میسر ہے کہ ایسے بگڑے ہوئے حالات میں اتنی بڑی قوم کی اصلاح کر سکیں۔ لیکن اللہ نے دل میں ایک درد دیا ہے' اور وہی درد مجبور کرتا ہے کہ جو تھوڑا سا علم اور نورِ بصیرت اللہ تعالیٰ نے بخشا ہے' اس سے کام لے کر مسلمانوں کو اسلامی تعلیم کے اصل منبع اور اسلامی تہذیب کی حقیقی اساس کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیں' اور کامیابی و ناکامی سے بے پرواہ ہو کر اپنی سی کوشش کر دیکھیں۔ کام کی بزرگی اور اپنی کمزوری کو دیکھ کر اپنی کوشش خود ہم کو ہیچ میرز معلوم ہوتی ہے' مگر کامیابی اور ناکامی جو کچھ بھی ہے اس قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا کام کوشش کرنا ہے' اور اپنی حدِ وسع تک ہم اپنی کوشش کے دائرے کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ (رجب ۱۳۵۴' ص ۷ تا ۱۴ / اکتوبر ۱۹۳۵)

اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے جو انعامات ہوئے ہیں' ان کا شکر بجا لانا میرا پہلا فرض ہے۔ اوّل تو یہی احسان کیا کم ہے کہ ایک حقیر گناہگار بندے کو دینِ حق کی خدمت کے لیے منتخب فرمایا گیا۔ حالانکہ اگر انتخاب کا معیار علم' تقویٰ' اخلاص اور کمالاتِ ظاہری و باطنی پر ہوتا تو شائد میں آخری شخص ہوتا جس کی طرف نگہِ انتخاب مائل ہوتی۔ پھر اس پر مزید احسان یہ ہے کہ میری تمام کوتاہیوں کی تلافی اپنے فضل و انعام سے کی گئی۔ بے علم تھا' نورِ علم عطا کیا گیا' ناواقفِ راہ تھا' راہِ راست کی طرف ہدایت بخشی گئی' کمزور اور پست ہمت تھا' صبر و ثبات اور استقامت کی توفیق دی گئی' بے سروسامان اور بے یار و مددگار تھا' خزانۂ غیب سے ہر ہر قدم پر سرو سامان بہم پہنچایا گیا۔ . . . یہ تو وہ احسانات ہیں' جن کو میں جانتا ہوں اور ان کا بھی پورا پورا شکر ادا کرنا میری قدرت سے باہر ہے' رہے وہ بے شمار احسانات جن کی مجھ کو خبر تک نہیں تو ان کا شکر کیسے بجا لاؤں ؟

بجز اس کے اور کیا کہہ سکتا ہوں!

شکر نعمت ہائے تو چندانکہ نعمت ہائے تو!

مگر حق تعالیٰ اپنے فضل و احسان میں جیسا فیاض ہے' یہ بندہ اس سے فضل و احسان کی طلب میں ویسا ہی حریص ہے۔ اس نے جو کچھ دیا ہے اس پر شکر ضرور ہے' مگر قناعت نہیں۔ خدا کے مقابلے میں قناعت کیسی ؟ وہ دینے سے نہیں تھکتا' تو بندہ مانگنے سے کیوں تھکے؟ اور اس سے نہ مانگے تو کس سے مانگے؟

میں علم کا پیاسا ہوں' اور اس پیاس کو بجھانے والا اس کے سوا کوئی نہیں۔ میری عقل و فہم میں ہزاروں کوتاہیاں ہیں' اور ان کو دور کرنے والا اگر کوئی ہے تو وہی ہے۔ میرا دل بے چین ہے' میری روح مضطرب ہے' میرا دماغ سکون سے محروم ہے' خدا ہی ہے جو اس بیماری کا مداوا کر سکتا ہے۔ میں گناہوں میں گھرا ہوا ہوں' میرے عمل میں لاکھوں خامیاں ہیں' میری فطرت کی کمزوریاں قدم قدم پر مرضاتِ الٰہی کے اتباع سے مجھ کو روکتی ہیں' خدا کے سوا کوئی نہیں' جو میرے عیوب کی اصلاح کرے اور عملِ صالح کی توفیق بخشے۔ میں اس خلوصِ نیت کا طلب گار ہوں' صحتِ فکر اور سدادِ نظر مانگتا ہوں' الحب فی اللہ اور البغض لِلّٰہ کی توفیق چاہتا ہوں۔ میں اس سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے بندوں سے بے نیاز کر کے صرف اپنا نیاز مند بنائے' محبت اور خوف اور طمع سب سے توڑ کر صرف اپنے ساتھ جوڑ دے اور اتنی قوت و طاقت عطا فرمائے کہ میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں اپنے دل کے سب حوصلے نکال سکوں۔ (محرم الحرام ۱۳۵۵ھ' ص ۲-۳ / اپریل ۱۹۳۶ء)

محض دولت ہرگز وہ چیز نہیں ہے جو کسی قوم کو معزز اور طاقت ور بناتی ہو۔ تمہارا ایک ایک شخص اگر لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جائے مگر تم میں کریکٹر کی طاقت نہ ہو تو یقین رکھو کہ دنیا میں تمہاری کوئی عزت نہ ہو گی۔ بخلاف اس کے اگر تم میں درحقیقت اسلامی سیرت موجود ہو' تم صادق اور امین ہو' لالچ اور خوف سے پاک ہو' اپنے اصول میں سخت اور اپنے معاملات میں کھرے ہو' حق کو حق اور فرض کو فرض سمجھنے والے ہو' حرام و حلال کی تمیز کو ہر حال میں ملحوظ رکھنے والے ہو' اور تم میں اتنی اخلاقی قوت موجود ہو کہ کسی نقصان کا خوف اور کسی فائدے کی طمع تم کو راستی سے نہ ہٹا سکے' اور کسی قیمت پر تمہارا ایمان نہ خریدا جا سکے' تو دنیا میں تمہاری ساکھ قائم ہو جائے گی۔ دلوں میں تمہاری عزت بیٹھ جائے گی۔ تمہاری ایک بات کا وزن لکھ پتی کی ساری دولت سے زیادہ ہو گا۔ تم جھونپڑیوں میں رہ کر اور پیوند لگے کپڑے پہن کر بھی دولت

سراؤں میں رہنے والوں سے زیادہ احترام کی نظر سے دیکھے جاؤ گے' اور تمہاری قوم کو ایسی طاقت حاصل ہو گی' جس کو کبھی نیچا نہیں دکھایا جا سکتا۔ (صفر ۱۳۵۵ھ' ص ۱۰۸ / مئی ۱۹۳۶ء)

"ترجمان القرآن" دراصل میری زندگی کا مشن ہے۔ میں نے جس کام کو اپنا مقصدِ حیات بنایا ہے' اسی کو انجام دینے کے لیے اس پرچہ کو چلا رہا ہوں۔ اب تک اس کام کو جو کچھ بھی مشکلات پیش آئیں' ان کا حال بجز میرے مخصوص دوستوں کے کسی کو معلوم نہ تھا۔ کیوں کہ رسالہ کا حال گویا میرا ذاتی حال ہے' اور پبلک میں میں نے اس کا اظہار کبھی مناسب نہیں سمجھا۔

"ترجمان القرآن" کی اشاعت اس وقت چھ سو ہے۔ دوسری قوموں کے علمی ذوق اور جرائد کی اشاعت کو دیکھتے ہوئے تو یہ تعداد بہت کم ہے۔ مگر مسلمانوں کی ذہنی حالت کے لحاظ سے اس کو بہت زیادہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ ان کی دلچسپیوں کا دائرہ دوسرا ہے۔ اس چھ سو کی تعداد میں پورے نصف کی خریدار سرکارِ آصفیہ ہے۔ اگر ان تین سو پرچوں کو الگ کر دیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کروڑوں مسلمانوں کی اس آبادی میں صرف تین سو اصحاب ایسے ہیں جو "ترجمان القرآن" کی وضع کا ایک رسالہ پڑھنے کے لیے کچھ خرچ کر سکتے ہیں۔ پھر ان تین سو میں سے بھی دس فیصدی حضرات اپنے بجٹ میں اس رسالہ کی پوری قیمت کے لیے گنجائش نہیں نکال سکتے۔ مگر چونکہ ہم خود ان تک اپنی آواز پہنچانے کے غرض مند ہیں' اس لیے ہم کو مجبوراً رعایتی قیمت پر بلکہ بسا اوقات برائے نام قیمت پر پرچہ ان کے نام جاری کرنا پڑتا ہے۔

ظاہر ہے کہ . . . اس آمدنی میں اتنی گنجائش کہاں کہ ایک اعلیٰ درجہ کے علمی رسالہ کی وہ ضروریات فراہم کر سکے جو طباعت کے مصارف سے بالا تر ہیں۔ نہ اس میں کتابیں خریدی جا سکتی ہیں جو علمی تحقیق کے لیے ناگزیر ہیں' نہ اس میں علمی رسالے خریدے جا سکتے ہیں جو نئی معلومات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں' نہ اس میں بلند پایہ مضامین لکھنے والوں کو ان کے وقت اور ان کی محنت کا کم سے کم معاوضہ دیا جا سکتا ہے' نہ اس میں اتنی گنجائش ہے کہ کسی ایک لائق آدمی کی بھی خدمات مستقل طور پر حاصل کی جا سکیں تاکہ وہ ادارت کے کالموں میں ایڈیٹر کا ہاتھ بٹا سکے۔ ایسی حالت میں پرچے کو نہ صرف زندہ رکھنے بلکہ اس کا معیار بھی قائم رکھنے کا تمام تر بار ایک تنہا شخص پر ہے۔ وہ اس دوگونہ مشکل میں مبتلا ہو گیا ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنا تمام وقت' اپنی پوری دماغی قوت اس پرچے کی ترتیب میں صَرف کر دے' اور دوسری

طرف نہ صرف اپنی ذاتی ضروریات بلکہ خود پرچے کی ضروریات کا بھی ایک معتدبہ حصہ کہیں اور سے فراہم کرے' جس کے لیے نہ اس کے پاس وقت بچتا ہے' اور نہ اس کے دل و دماغ میں اتنی طاقت باقی رہتی ہے کہ دوسرا کام کر سکے۔

اس حالت پر شکایت کا کوئی محل نہیں۔ اس لیے کہ "ترجمان القرآن" سے مسلمانوں کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہے' جس میں مدد نہ دینے کی کوئی شکایت ان سے کی جا سکے۔ یہ تو میری اپنی غرض ہے کہ میں اپنی آواز ان تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ جو شخص کوئی ایک بھی دل خوش کن بات نہ سنا سکتا ہو' بلکہ جس سے قریب قریب ہر گروہ کو کچھ نہ کچھ تلخ باتیں سننی پڑتی ہوں' وہ نہ تو کسی سے مدد طلب کرنے کا حق رکھتا ہے' اور نہ اس کو ایسی کوئی امید رکھنی چاہیے۔ درحقیقت ان لوگوں کا احسان ہے جو اس رسالہ کو پڑھ لیتے ہیں' اور اس سے زیادہ احسان ان لوگوں کا ہے جو اس کو پڑھنے کے ساتھ اس کی پوری یا ادھوری قیمت بھی ادا کرتے ہیں۔ اب اس کے بعد کسی مزید احسان کی درخواست نہ میں کر سکتا ہوں نہ کرنا چاہتا ہوں۔ (جمادی الاخریٰ ۱۳۵۵' ص ۲۸۳ - ۲۸۴ / ستمبر ۱۹۳۶)

نشیب و فراز کے۔ . . مسلسل تجربات اور نصرتِ الٰہی کے پیہم مظاہرات نے اب دل میں اس امر کا اذعان سا پیدا کر دیا ہے کہ یہ خدمت بارگاہِ الٰہی میں کسی حد تک مقبول ضرور ہے' اور اس مقبولیت کی بنا پر اس کے ساتھ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ کا سا معاملہ ہو رہا ہے۔ گو ظاہر حالات کے اعتبار سے خارج میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اب زمانہ کا وہی رنگ ہے' جسے دیکھ دیکھ کر دل ٹوٹا جاتا تھا' ہمت بیٹھی جاتی تھی' حوصلے پست ہوئے جاتے تھے۔ لیکن اب باطن کا وہ حال نہیں جو پہلے تھا۔ اب دل میں ایک اطمینان ہے' روح میں ایک سکون ہے' حوصلوں میں ایک نئی قوتِ پرواز اور عزائم میں ایک خاص طاقتِ ثبات محسوس ہوتی ہے۔ پہلے صبر اور توکل کے الفاظ ذہن میں تھے' روح میں ان کے معانی کا تحقق اب شروع ہوا ہے۔ پہلے صرف یہ اعتقاداً سمجھتے تھے کہ خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے' چار سال کی مشقِ تمرین کے بعد اب کچھ سمجھ میں آنے لگا ہے کہ خدا پر بھروسہ کرنے کے معانی کیا ہیں؟ اور اس پر بھروسہ کرنے والوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔ یہی وہ نعمت ہے برسوں سے جس کی طلب تھی' اور اب کہ اس بخشش کا آغاز ہوا ہے' صمیمِ قلب کے ساتھ بخشنے والے کا شکریہ ادا کرتا ہوں' اور ادائے شکر کے ساتھ یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ اس نعمت کا اتمام فرمایا جائے۔ کیونکہ اب جو مرحلہ درپیش ہے اس میں سب سے بڑھ کر اسی کی

ضرورت ہے۔

میں ایک مجاہد کے سے ایمان کا طالب ہوں' ایسا دل مانگتا ہوں جو سمندر کی طوفانی موجوں کے مقابلہ میں ٹوٹی ہوئی کشتی لے جانے پر بے جھجک آمادہ ہو جائے' ایسی روح مانگتا ہوں جو شکست کھانے اور سپر رکھ دینے کا تصور بھی نہ کر سکتی ہو' ایسی عزیمت مانگتا ہوں جو مادی سہاروں سے قطعاً مستغنی ہو' اور تمام سہاروں کے چھوٹ جانے پر بھی نہ ٹوٹ سکے' ایسا ارادہ مانگتا ہوں جسے کوئی طاقت اپنے مقصد کے راستہ سے نہ ہٹا سکے۔ (محرم الحرام ۱۳۵۶ھ' ص ۲ / اپریل ۱۹۳۷ء)

مسلمانوں کی اصلی کمزوری کو تاڑ لیا گیا ہے۔ . . انھیں کھینچنے کے لیے جو صدا بلند کی جا رہی ہے۔ . . وہی پیٹ اور روٹی کی ذلیل صدا ہے' جو ہمیشہ خود غرض اور شکم پرست حیوانات کو اپنی طرف کھینچتی ہی ہے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ تہذیب کیا بلا ہے؟ . . . اصلی سوال تو پیٹ کا سوال ہے۔ اسی سوال کو حل کرنے کے لیے ہم اٹھے ہیں۔

دنیا میں انقلاب کی رفتار بہت تیز ہے' اور روز بروز تیز تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جو تغیرات صدیوں میں ہوتے تھے' اب وہ برسوں میں ہو رہے ہیں' پہلے انقلاب بیل گاڑیوں اور ٹٹوؤں پر سفر کرتا تھا۔ اب ریل اور تار اور اخبار اور ریڈیو پر حرکت کر رہا ہے۔ آج وہ حالت ہے کہ ع

یک لحظہ غافل بودہ ام صد سالہ راہم دور شد

(محرم الحرام ۱۳۵۶ھ' ص ۱۴ / اپریل ۱۹۳۷ء)

تحریکِ خلافت کی ناکامی کے بعد سے کامل پندرہ برس تک مسلمان جس انتشارِ فکر و عمل میں مبتلا رہے' اس کو دیکھ دیکھ کر دل خون ہوا جاتا تھا۔ مگر ہمیشہ یہی خیال لب کشائی سے روکتا رہا کہ میدان میں مجھ سے زیادہ علم اور تجربہ اور قوت اور اثر رکھنے والے موجود ہیں۔ وہ کبھی نہ کبھی حالات کی اصل خرابی کو محسوس کریں گے' اور ان کو رفع کرنے کے لیے متحد ہو کر وہ تدبیریں اختیار کریں گے جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کو اختیار کرنی چاہئیں۔ لیکن دن پر دن گزرتے چلے گئے' اور یہ امید بر نہ آئی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے قسمت کے فیصلے کا آخری وقت ہے۔ دل کی آنکھوں نے صاف دیکھ لیا کہ اب اگر اس قوم نے کوئی غلط اقدام اٹھایا تو سیدھی ہلاکت کے گڑھے کی طرف جائے گی اور اس کے ساتھ چشمِ دل ہی نہیں چشمِ سر نے بھی یہ دیکھا کہ جن کی تدبیر و تدبر پر اس قوم کے مستقبل کا انحصار ہے' وہ

بھی اب حالات کو اس فراست کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں جسے فراستِ مومن کہا گیا ہے۔ اور اسی کوتاہی کی بنا پر ایسے نازک وقت میں مسلمانوں کو ان مختلف راستوں پر چلائے جا رہے ہیں جن میں سے کوئی بھی منزلِ نجات کی طرف نہیں جاتا۔ اس مرحلے پر پہنچ کر ضمیر نے آواز دی کہ یہ وقت خاموش بیٹھنے کا نہیں ہے۔ اب دین و ملت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ مسلمانوں کو، ان کے عوام اور خواص، علما و زعما، سب کو ان حقیقی خطرات کی طرف توجہ دلائی جائے جو مسلم قوم ہونے کی حیثیت سے ہمیں درپیش ہیں۔ اور اس کے ساتھ انھیں یہ بھی یاد دلایا جائے کہ تمہارے لیے ہدایت کا اصلی سرچشمہ خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سیرتِ پاک میں ہے، جس کو چھوڑ کر محض اپنی فکر اور تدبیر پر اعتماد کر لینا ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔ (ذی القعدہ ۱۳۵۶ھ، ص ۳۲۱ - ۳۲۲ / جنوری ۱۹۳۸ء)

میں دراصل ایک شفاخانہ قائم کر رہا ہوں۔ دین داروں میں جو مالدار ہیں وہ اس شفاخانہ کے قائم کرنے میں حصہ لیں اور ان میں سے جو غریب ہیں وہ اس کی دوائیں مریضوں تک پہنچانے میں حصہ لیں۔ اصل سعادت یہ ہے کہ آپ کے دل میں قومی امراض کے استیصال اور شفائے ربانی کے ایصال کا جذبہ ہو۔ آپ کا دل ایک ایسی ماں کا سا دل ہونا چاہیے جو اپنے بچوں کو بیمار دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہے، اور ان کے علاج میں کسی امکانی کوشش اور کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ آپ جن لوگوں میں رہتے ہیں، جن سے ملتے جلتے ہیں، ان میں . . . دیکھیے کہ کون کون بیمار ہیں، اور کس کس مرض کے بیمار ہیں۔ جو شخص جس مرض میں مبتلا ہو اسی مرض کی دوا اس کو دیجیے۔ زندقہ و الحاد کا مریض ہو تو اسے "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" پڑھایئے۔ وطن پرستی کا بیمار ہو تو "قومیت اسلام" دیجیے۔ کمیونزم کا حملہ کسی پر ہو گیا ہو، اس کا علاج "سود" کے مضمون سے کیجیے۔ آزادیِ نسواں کی بیماری میں "پردہ" کی خوراک استعمال کرایئے۔ فرنگیت کے بیماروں کو "اشارات" کے مختلف مجموعے دیجیے۔ جتنی وبائیں آج کل آپ کی قوم میں پھیلی ہوئی ہیں ان کو مٹانے پر کمربستہ ہو جایئے۔ آپ خدا کے ثواب کی خواہش رکھتے ہیں تو خدا کا ثواب اتنا سستا نہیں کہ محض دس پانچ روپے دے کر خرید لیا جائے۔ اس کے لیے جہاد کی ضرورت ہے، اور جہاد یہی ہے کہ آج رسول اللہؐ کے گھر میں جو آگ لگ رہی ہے اس کو بجھانے کی کوشش کیجیے۔ (ربیع الاول ۱۳۵۶ھ، ص ۱۶۷ / فروری ۱۹۳۷ء)

دس سال تک جو شخص ایک جگہ رہا ہو' اور من کل الوجوہ اس کو وطن بنا چکا ہو' اس کے لیے یکایک اپنا گھر بار اٹھا کر ڈیڑھ ہزار میل دور لے جانا بہرحال کچھ نہ کچھ پریشانیوں کا موجب تو ہونا ہی چاہیے' چنانچہ پریشانیاں پیش آئیں اور انھی کی وجہ سے ذی الحجہ اور محرم کے پرچے شائع نہ ہو سکے۔ رسالہ کے ناظرین کو پہلے ہی سے پرچہ کے بروقت شائع نہ ہونے کی شکایت تھی۔ اب اتنے طویل التوا نے ان کو بالکل بے صبر کر دیا' اور دفتر میں شکایات کے انبار لگ گئے۔ میں درحقیقت اس بات پر بہت شرمندہ ہوں کہ خریداروں کو بار بار شکایات کا موقع ملتا ہے' لیکن اگر اس رسالہ کے ناظرین میں یہ احساس پیدا ہو چکا ہے کہ وہ محض رسالے کے خریدار نہیں ہیں بلکہ میرے رفیقِ کار ہیں' تو ان کا رفیق ان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کی مشکلات میں شکایت سے زیادہ ہمدردی سے کام لیں گے۔ (ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ' ص ۴۵۶م فروری ۱۹۳۸)

دارالاسلام پہنچ کر پہلا کام جو کیا گیا وہ یہ تھا کہ یہاں کی مسجد کو اس علاقہ کے لیے مسجدِ جامع قرار دے کر پانچ پانچ میل تک دیہات میں اعلان کرا دیا گیا کہ آئندہ سے وہ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے یہاں آیا کریں۔ خطیب کے فرائض میں نے خود اپنے ذمہ لیے' اور نہایت سہل زبان میں جس کو ایک ان پڑھ دیہاتی بھی سمجھ سکے' خطبات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ الحمد للہ کہ اس کا اثر خاطر خواہ رونما ہوا۔ پہلے جمعہ میں قریب قریب پچاس آدمی تھے اور دوسرے میں ۹۰ آئے اور تیسرے میں ۱۵۳ تک تعداد پہنچ گئی۔ اردو کے خطبہ سے لوگوں میں اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی کہ ۵ میل کی حد سے باہر کے لوگ بھی خطبہ سننے کے لیے آجاتے ہیں۔ اس سے زیادہ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ دیہات کے لوگ خطبات کو کافی دلچسپی کے ساتھ سنتے ہیں' سمجھتے ہیں اور نماز سے واپس جا کر ان کا مفہوم دوسرے لوگوں سے بیان کرتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کی تنظیم کا پہلا قدم ہے۔

ہر مسلمان کے اندر منظم ہونے کی فطری استعداد ہر وقت قوت سے فعل میں آنے کے لیے تیار ہے۔ وہ خدا اور رسولؐ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ ہی ایک انجمن کا ممبر بن چکا ہے۔ اب اس کے سوا کسی چیز کی حاجت نہیں کہ اس کی ممبر شپ کو تازہ کر دیجیے۔ اسے یاد دلا دیجیے کہ یہی وہ انجمن ہے جس کا تو ممبر ہے' اور خدا کے مقررہ پروگرام کے مطابق ہر ہفتہ اس کو اپنے مرکز کی طرف سمٹتے رہنے کی عادت ڈال دیجیے۔ جمعہ کی طاقت وہ زبردست طاقت ہے جو آٹھ کروڑ مسلمانوں کو دیکھتے دیکھتے ایک کانگرس بنا سکتی ہے۔ یہ ایسا ماس کانٹیکٹ (ربطِ عوام) ہے جس کا

تصور بھی کسی جواہر لال اور کسی گاندھی کے دماغ میں نہیں آسکتا۔ اس کے ذریعے سے آپ جمہور مسلمین کی تمدنی اصلاح، معاشی فلاح، تعلیم عمومی اور سیاسی تنظیم کے سارے پروگرام بتدریج عمل میں لا سکتے ہیں، بشرطیکہ جمعہ کی طاقت کو سمجھنے والے اور اس سے حکمت کے ساتھ کام لینے والے پیدا ہو جائیں اور ہمارے نئے تعلیم یافتہ نوجوان اور پرانے گروہ کے علما، جو خیالاتِ خام کے پیچھے دوڑے پھر رہے ہیں، ایک ضابطہ کے ساتھ ایک ان تھک کوشش کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ یہ کام کسان کا صبر چاہتا ہے اور اسے وہی لوگ کر سکتے ہیں جو جلسوں اور جلوسوں کی چاشنی کے بغیر خشک اور بے مزہ محنت کی تلخیاں اپنے مقصد کی دھن میں گوارہ کر سکتے ہیں۔

جو حضرات درحقیقت کچھ کام کرنا چاہتے ہیں ان کو میں مشورہ دوں گا کہ اسی طرز پر اپنے حلقوں میں جمعہ کی مرکزیت قائم کرنے کی کوشش کریں اور اس اجتماع سے زیادہ سے زیادہ جتنا کام لینا ممکن ہو، لیں۔ اپنے خطباتِ جمعہ کو میں نمونہ کے طور پر "ترجمان القرآن" میں شائع کرتا رہوں گا۔ ان سے لوگوں کو معلوم ہو گا کہ اختلافی مسائل سے بچ کر خطبہ جمعہ سے عامۃ المسلمین کو اصولِ دین کی تعلیم دینے اور ان کے اندر مسلمان ہونے کا احساس زندہ کرنے کا کام کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہاں جمعہ کی مدد سے تنظیم اور اصلاحِ عوام کا کام جس جس طریقہ سے لیا جائے گا اس کی تفصیلات بھی شائع کی جاتی رہیں گی، تاکہ جو لوگ کام کرنا چاہتے ہیں وہ اس طریقہ کی پیروی کر سکیں۔ اس کا یہ مدعا نہ سمجھ لیا جائے کہ لوگ بجنسہٖ انھی خطبوں کو پڑھیں یا ہو بہو ان کاموں کی نقل اتاریں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کو اصول اور طریقِ کار سمجھ لینا چاہیے اور اپنے اپنے مقامی حالات کے لحاظ سے اس کو عمل میں لانا چاہیے۔ (ذی الحجہ ۱۳۵۶، ص ۳۶۵ تا ۳۶۷ / فروری ۱۹۳۸)

توحید اور اجتماعی زندگی

ایک مکمل اسلامی زندگی کی عمارت اگر اٹھ سکتی ہے تو صرف اسی اقرارِ توحید پر اٹھ سکتی ہے جو انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی پر وسیع ہو۔ جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو اور اپنی ہر چیز کو خدا کی ملک سمجھے۔ اس کو اپنا اور تمام دنیا کا ایک ہی جائز مالک، معبود، مطاع اور صاحبِ امر و نہی تسلیم کرے۔ اسی کو ہدایت کا سرچشمہ مانے اور پورے شعور کے ساتھ اس حقیقت پر مطمئن ہو جائے کہ خدا کی اطاعت سے انحراف، یا اس کی ہدایت سے بے نیازی، یا اس کی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات میں غیر کی شرکت جس پہلو اور رنگ میں بھی ہے سراسر ضلالت ہے

(ایک بندۂ خدا)

(اشتہار)

۶۰ سال پہلے

میں امکانی حد تک کوشش کرتا ہوں کہ رسالے کو بہتر سے بہتر مرتب کروں اور مفید مضامین فراہم کروں۔ مگر افسوس ہے کہ چند مخلص احباب کے سوا کوئی میری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ ہندوستان کے اہلِ علم جو اعلیٰ معیار کے مضامین لکھ سکتے ہیں، کوئی توجہ نہیں فرماتے۔ اور دستِ سوال دراز کرنے کی مجھے عادت نہیں، ناچار خود ہی جو کچھ بن پڑتا ہے، کرتا ہوں۔

بعض احباب کا تقاضا ہے کہ "ترجمان القرآن" کو ابواب میں تقسیم کر دیا جائے، اور مستقل عنوانات کے تحت مضامین درج کیے جایا کریں۔ مجھے خود بھی ابتدا سے اس ضرورت کا احساس تھا۔ مگر مضامین کی قلت اس طریق کو اختیار کرنے میں مانع تھی۔ گو یہ مشکل اب بھی باقی ہے مگر اس کی وجہ سے رسالے کی اصلاح و ترقی میں مزید تعویق مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ لہٰذا اس مہینے نئی ترتیب کی ابتدا کی جاتی ہے۔ اب اس رسالے کے مستقل ابواب حسبِ ذیل ہوں گے:

اشارات۔

مقالات۔

تنزیل و تاویل۔ اس باب میں تفسیری مباحث درج کیے جائیں گے۔

حاملان قرآن۔ یہ باب مفسرین کے احوال اور قرآن مجید کی خدمت کے سلسلہ میں ان کے کارناموں کے بیان پر مشتمل ہو گا۔

رسائل و مسائل۔ مراسلہ نگاروں کے شکوک و شبہات اور ان کے جوابات اس باب میں درج کیے جائیں گے۔

تقریظ و انتقاد۔ اس باب میں خاص خاص کتابوں پر مفصل تبصرے ہوں گے۔

مطبوعات۔ یہ باب مختصر تبصروں کے لیے مختص ہو گا۔

اس سلسلہ میں اگر ناظرینِ "ترجمان القرآن" کسی اور چیز کی ضرورت محسوس کرتے ہوں تو اپنے خیالات سے مجھے مطلع فرمائیں۔ اصلاح و ترقی کی ہر مناسب تجویز شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی۔

(اشارات، سید ابوالاعلیٰ مودودی، ترجمان القرآن، جلد ۲، نمبر ۵، جمادی الاولیٰ ۱۳۵۳ھ، مطابق اگست ۱۹۳۴ء)

فہم القرآن

علامہ ابنِ تیمیہؒ کے نزدیک فہمِ قرآن کے اصول

احسان اللہ فہد فلاحی

قرآن جہاں اپنی ادبی فصاحت و بلاغت میں ایک عظیم الشان معجزہ ہے' وہیں اپنے معنی و مفہوم کے اعتبار سے بھی دنیا کی تمام کتابوں پر عظیم الشان فوقیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ قرآن کا اعجاز قرآن کے مقاصد میں سے نہیں بلکہ اس کے لوازم میں سے ہے۔ قرآن کا مقصد دنیائے انسانیت کو صحیح راہ دکھانا ہے۔ یہ مسلمانوں کی بدنصیبی ہے کہ وہ کتاب اللہ کو کتابِ ہدایت سمجھنے کے بجائے بحث و جدل' علمی ورزش اور اظہارِ قابلیت کا ذریعہ بنا چکے ہیں۔ پہلے یونانی فلسفہ' ایرانی اوہام و خرافات اور ہندوستانی تصوف کی بھول بھلیوں میں علمائے تفسیر بھٹک رہے تھے۔ آج یورپ کی ذہنی غلامی نے ان کی عقلوں پر قبضہ کر رکھا ہے' اور وہ مغربی افکار و نظریات کو کتاب اللہ سے زبردستی ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ قرآن پاک بنیادی طور پر نہ عقلیات کی کتاب ہے نہ سائنس کی' وہ تو کتابِ ہدایت ہے۔ قرآن پاک بالکل آغاز ہی میں اپنے مقصد اور نصب العین کی خود ہی وضاحت کرتا ہے

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ (البقرہ ۲ : ۲)

یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں' ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ○ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (المائدہ ۵:۱۵-۱۶)

تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آگئی ہے اور ایک ایسی حق نما کتاب جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اس کی رضا کے طالب ہیں' سلامتی کے طریقے بتاتا ہے اور

اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے' اور راہِ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

قرآن پاک سے ہدایت حاصل کرنے کے کچھ اصول و آداب ہیں۔ محض تبرک کے طور پر قرآنی الفاظ کی تلاوت کر لینا اور معانی کی طرف دھیان نہ دینا صحابہ کرامؓ اور اسلافِ عظام کا طریقہ نہ تھا۔ یہ غلط تصور تو اس وقت سے رائج ہوا جب لوگوں نے قرآن کو کتابِ ہدایت ماننے کے بجائے اسے حصولِ برکت کی کتاب سمجھنا شروع کیا۔ علما اور اسلاف نے قرآن سے صحیح استفادہ کے لیے کچھ اصول اور وسائل ناگزیر قرار دیے ہیں جن کو نظرانداز کر کے فہمِ قرآن کی راہیں ہموار نہیں ہو سکتیں۔ شیخ الاسلام احمد بن عبدالحلیم بن تیمیہؒ (۶۶۱ - ۷۲۸ھ) نے فہمِ قرآن کے مندرجہ ذیل اصول بتائے ہیں:

۱- شیخ الاسلام کے نزدیک فہمِ قرآن کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کو قرآن کے ذریعہ سمجھا جائے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے افہام و تفہیم کی خاطر اسرار و حکم کو گوناں گوں پیرایوں میں بیان کیا ہے۔ اس کے لیے قرآن میں "تصریف" کا لفظ استعمال ہوا ہے' جس کا مطلب گردش کرنا ہے۔ جب ایک طالب علم قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو اسے ایک ہی مضمون تکرار کے ساتھ مختلف سورتوں میں نظر آتا ہے۔ لیکن جب وہ اس پر غور کرتا ہے تو اس کے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن تکرارِ محض سے بالکل پاک ہے۔ اس میں ایک ہی مضمون کو تکرار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے تو وہ بعینہٖ ایک ہی پیش و عقب اور ایک ہی قسم کے لواحق و تضمنات کے ساتھ نہیں بلکہ ہر جگہ اس کے اطراف و جوانب اور اس کے تعلقات و روابط بدلے ہوئے ہیں۔ مقامِ مناسبت سے اس میں تبدیلیاں موجود ہیں۔ ایک مقام پر جو پہلو مخفی ہوتا ہے' دوسرے مقام پر واضح ہو جاتا ہے۔ ایک مقام پر اس کا رخ غیر معین ہوتا ہے' دوسرے مقام پر واضح ہو جاتا ہے۔ ایک لفظ ایک آیت میں بالکل مبہم نظر آتا ہے' دوسری آیت میں وہ لفظ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک جگہ ایک بات کی دلیل سمجھ میں نہیں آتی' لیکن اسی بات کو دوسری جگہ تفصیل سے بیان کر دیا گیا ہے۔ ابنِ تیمیہؒ کے اس اصول کی صداقت خود قرآن سے معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا اعلان ہے:

الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ○ (ھود ۱۱ : ۱)

ال رٰ' فرمان ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں' ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے۔

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (حم السجدہ ۴۱ : ۳)

ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی زبان کا قرآن ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (الاعراف ۷ : ۵۲)

ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لے آئے ہیں جس کو ہم نے علم کی بنا پر مفصل بنایا ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

۲۔ علامہ کے نزدیک فہمِ قرآن کا دوسرا اصول یہ ہے کہ سنتِ نبویؐ اور احادیثِ نبویؐ کی مدد سے قرآن کا فہم کیا جائے، کیونکہ قرآن حکیم نقشہ تعمیر ہے اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس نقشہ کے مطابق تیار کی ہوئی عمارت ہے۔ نقشہ کے ساتھ انجینئر بھیجنے کے اصول پر اس وقت سے عمل درآمد ہو رہا ہے جب سے ہدایتِ الٰہی کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس بنا پر حالات و زمانہ کے تقاضوں کی مناسبت سے عمارت کی تعمیر انجینئر کی بنائی ہوئی عمارت کو قطعاً نظرانداز کر کے اصل نقشہ کے مطابق نہیں ہو سکتی۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کو قرآن کا شارح قرار دیا ہے:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (النحل ۱۶ : ۴۴)

اور اب یہ ذکر تم پر نازل کیا ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ط (المائدہ ۵ : ۶۷)

اے پیغمبرؐ، جو تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ط وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۝ (النساء ۴ : ۱۰۵)

اے نبیؐ، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمھاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہِ راست اللہ نے تمھیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (النحل ۱۶ : ۶۴)

ہم نے یہ کتاب تم پر اس لیے نازل کی ہے کہ تم ان اختلافات کی حقیقت ان پر کھول دو جن میں یہ پڑے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب رہنمائی اور رحمت بن کر اتری ہے ان لوگوں کے لیے جو اسے مان لیں۔

اسی وجہ سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ۔

معلوم ہے مجھے قرآن بھی بخشا گیا ہے اور قرآن کے ساتھ اس کا مثل بھی۔

اور یہ مثیلِ قرآن سنت ہے۔ مندرجہ بالا آیت کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ جو چیزیں قرآن میں نہ مل سکیں ان کو سنت میں تلاش کرو۔ جیسا کہ حضرت معاذؓ سے یمن روانہ کرتے وقت اللہ کے رسولؐ نے سوال فرمایا تھا "کس چیز سے فیصلہ کرو گے"۔ معاذؓ نے فرمایا' کتاب اللہ سے۔ فرمایا "اگر اس میں نہ ملے"۔ معاذؓ نے عرض کیا' سنتِ رسولؐ سے۔ فرمایا "اگر سنت میں بھی نہ پایا"۔ عرض کیا' اس صورت میں اپنے اجتہادِ رائے سے کام لوں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر معاذؓ کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا "خدا کا شکر ہے جس نے رسول اللہؐ کے قاصد کو وہ توفیق بخشی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے"۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا طرزِ عمل منقول ہے کہ آپ کے سامنے کوئی قانونی معاملہ آتا تو پہلے قرآن کریم میں اس کا حل تلاش کرتے۔ اگر وہاں نہ ملتا تو سنت کی طرف رجوع کرتے۔ اگر سنت میں بھی نہ ملتا تو لوگوں سے دریافت کرتے کہ اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کا کسی کو علم ہے۔ بسا اوقات صحابہؓ میں سے کچھ لوگ بتا دیتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں یہ فیصلہ فرمایا ہے تو صدیق اکبرؓ سنت کی سند ملنے پر خوش ہو کر فرماتے تھے کہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایسے لوگوں کو باقی رکھا جن میں ہمارے نبی کی سنتیں محفوظ ہیں۔
حضرت عمرؓ نے قرآن فہمی کے سلسلے میں سنت کی تشریحات کو بنیاد بناتے ہوئے ایک موقعہ پر فرمایا:
"آیندہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآنی متشبہات میں تم سے جھگڑیں گے۔ ایسی صورت میں سنتوں کے ذریعے ان پر حجت قائم کرنا' کیونکہ اصحابِ سنن' کتاب اللہ کو خوب جانتے تھے"۔ ائمہ قانون نے بھی قرآن فہمی اور قانون کے مرحلہ میں سنت کو خاص اہمیت دی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے "اگر سنتیں نہ ہوتیں تو ہم میں سے کوئی شخص قرآن کا فہم حاصل نہ کر سکتا تھا"۔
مزید وضاحت اس قول سے ہوتی ہے "کہ لوگ اس وقت تک خیر و صلاح میں رہیں گے جب تک ان میں حدیث کے طالب موجود ہوں گے۔ اور جب وہ بغیر حدیث کے علم حاصل کریں گے تو بگاڑ اور فساد میں مبتلا ہو جائیں گے"۔ امام شافعیؒ نے تو وضاحت سے کہہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم بھی دیا وہ قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔

۳۔ امام ابنِ تیمیہؒ کے نزدیک فہمِ قرآن کا تیسرا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی چیز قرآن و سنت

سے سمجھ میں نہ آسکے تو اس کو اقوالِ صحابہؓ سے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ محض قرآن و حالات کے مشاہدے کی وجہ سے وہ مطالبِ قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے اور مکمل فہم اور عملِ صالح کے مالک تھے۔ امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبریؒ نے بھی اپنے اسناد سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ "قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ کتاب اللہ کی کوئی آیت نازل نہیں ہوئی جس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو کہ کس کے حق میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔ اگر میں کسی ایسے شخص کو جانتا جو مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کا علم رکھتا ہے اور اس کے پاس سواری سے پہنچا جا سکتا تو میں ضرور اس کے پاس جا پہنچتا"۔ سلیمان بن مہران الاعمش کوفیؒ نے اپنے اسناد سے عبداللہ بن مسعودؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ "ہم میں سے کوئی دس آیتوں سے زیادہ اس وقت تک نہیں پڑھتا تھا جب تک کہ ان آیتوں کے معانی کی معرفت نہ حاصل کر لے۔ اور ان پر عمل میں بھی پختہ نہ ہو جائے"۔

۴۔ علامہ نے فہمِ قرآن کا چوتھا اصول یہ بتایا ہے کہ اسرائیلی روایات سے اجتناب کیا جائے۔ علامہ کے نزدیک اسرائیلی روایات استشہاد کے لیے تو استعمال کی جا سکتی ہیں، لیکن اعتقاد کے لیے نہیں روایت کی جا سکتیں۔ اسرائیلیات تین طرح کی ہو سکتی ہیں۔ پہلی قسم کی اسرائیلیات تو وہ ہیں جن کے بارے میں قرآن خاموش ہے، نہ قرآن نے اس کی تصدیق کی ہے اور نہ تکذیب۔ تو ایسی اسرائیلیات پر شیخ الاسلام نہ ایمان رکھتے ہیں اور نہ انکار کرتے ہیں۔ اس طرح کی روایات زیادہ سے زیادہ استشہاد کے لیے جائز ہو سکتی ہیں۔ دوسری قسم کی اسرائیلیات وہ ہیں جن کی صحت پر قرآن کی آیات دلیل ہیں۔ لیکن تیسری قسم کی وہ جھوٹی اسرائیلیات ہیں جن کے بارے میں قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ یہ روایات غلط ہیں۔ ایسی روایات کو شیخ الاسلام نے باطل قرار دیا ہے۔ لیکن زیادہ تر اسرائیلیات کے بارے میں خود علمائے اہلِ کتاب کے اندر زبردست اختلاف ہے۔ اس لیے ان روایات سے دین میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اسرائیلیات کے سلسلے میں علمائے اہلِ کتاب کے اندر اختلاف کی وجہ سے مفسرینِ قرآن نے اصحابِ کہف، ان کے کتے کا رنگ اور ان کی تعداد میں اختلاف کیا ہے۔ اللہ نے ان امور کو قرآن میں مبہم رکھا ہے اور ان کے علم سے بھی دین و دنیا میں کسی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ مگر اس کے بارے میں اہلِ کتاب کا اختلاف نقل کرنا جائز ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس اختلاف کا ذکر فرمایا ہے۔ (الکہف ۱۸: ۲۲)

۵۔ علامہ کے نزدیک فہمِ قرآن کا پانچواں اصول تابعین کے اقوال سے استدلال ہے۔ جب

کوئی چیز قرآن میں نہ ملے اور اس کے بعد سنت میں نہ ملے اور نہ اقوالِ صحابہؓ میں تو ایسی صورت میں اقوالِ تابعین کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ مثلاً مجاہد بن جبیرؒ' سعید بن جبیرؒ' عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ' عطا بن ابی رباحؒ' حسن بصریؒ' سعید بن المسیب وغیرہ وہ تابعی علما ہیں جو محدثین و مفسرین کے نزدیک معتبر اور ثقہ ہیں۔ مجاہدؒ علمِ تفسیر میں خدا کی نشانی تھے۔ محمد بن اسحاق نے اپنی اسناد سے روایت کیا ہے کہ مجاہدؒ کہتے تھے کہ میں نے مصحفِ قرآنی تین مرتبہ شروع سے آخر تک عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے پیش کیا۔ ہر آیت پر ان کو ٹھہراتا اور تفسیر پوچھتا تھا"۔ ترمذیؒ نے اپنی سند سے مجاہدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ "قرآن میں کوئی آیت نہیں جس کی تفسیر میں کچھ نہ کچھ میں نے نہ سنا ہو"۔ ترمذی ہی کی روایت ہے' مجاہدؒ نے کہا کہ اگر میں نے عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت لی ہوتی تو قرآن کے بارے میں عبداللہ بن عباسؓ سے کچھ پوچھنے کی نوبت پیش نہ آتی۔ ابنِ جریرؒ نے ابنِ ابی ملیکہؒ سے روایت کیا ہے کہ میں نے مجاہدؒ کو دیکھا کہ اپنے کاغذ قلم لیے ابن عباسؓ کے پاس پہنچے اور تفسیرِ قرآن کے بارے میں سوال کرنا شروع کیا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا' لکھتے جاؤ۔ اس طرح مجاہد نے پوری تفسیر پوچھ لی۔ اس لیے سفیان ثوریؒ کہا کرتے تھے کہ جب مجاہدؒ سے تفسیر ملے تو یہ تمہارے لیے کافی ہے۔ لیکن جب تابعین کے اقوال میں اختلاف ہو جائے تو اس صورت میں اس سے استدلال لازم نہیں ہے۔ ایسی صورت میں قرآن و سنت کی زبان کو' عام لغتِ عرب کو یا اقوالِ صحابہؓ کو مدِنظر رکھنا چاہیے۔ لیکن جب تابعین کا کسی آیت کے بارے میں اجماع ہو جائے تو وہ تمام لوگوں کے لیے حجت ہے۔ اس سے استدلال لازم ہے۔

۶- فہمِ قرآن کے سلسلے میں علامہ کا چھٹا اصول یہ ہے کہ محض رائے سے من گھڑت تفسیر کرنا حرام ہے۔ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "جو شخص بغیر علم کے قرآن میں گفتگو کرتا ہے' اپنے لیے دوزخ میں ٹھکانہ بناتا ہے"۔ سنن ترمذی میں حضرت جندبؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی قرآن میں اپنی رائے سے کہے اور اس کا کہنا صحیح ہو تو بھی وہ غلطی کا مرتکب ہے۔ ترمذی نے اس حدیث کو غریب بتلایا ہے اور بعض علمائے حدیث نے اس کے راوی سہیل بن ابی حزم کے ثقہ ہونے میں کلام کیا ہے۔ رسول اللہؐ کی انھی حدیثوں کی وجہ سے اہلِ علم کا کہنا ہے کہ رسول اللہؐ کے ساتھی اور آپؐ کے بعد کے سلف صالحین' بغیر علم کے قرآن کی کسی آیت کی تفسیر ہرگز نہ کرتے تھے۔ جو شخص بغیر علم کے قرآن کی تفسیر کرتا ہے اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو جہل کی حالت میں لوگوں کے فیصلے کرنے بیٹھ جائے' اور غلط فیصلے کر کے جہنم کا ایندھن بن جائے۔ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین ایسی تفسیر سے

گریز کرتے تھے جن کے بارے میں ان کو علم نہ ہو۔ حضرت شعبہؒ کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا: کون زمین مجھے اٹھائے گی اور کون آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اگر کتاب اللہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں۔ امام عبد بن حمید نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ ہم حضرت عمرؓ کے پاس موجود تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ان کے کرتے کی پیٹھ پر چار پیوند لگے ہوئے ہیں۔ پھر انھوں نے پڑھا فاکھتہ واباً پھر کہنے لگے کہ یہ "اب" کیا ہے۔ پھر خود ہی کہا' اسی کو تکلف کہتے ہیں' تو اگر نہیں جانتا تو حرج بھی کیا ہے۔ امام ابوعبید نے ابن ابی ملیکہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے ابن عباسؓ سے سوال کیا کہ اس ارشادِ قرآنی میں دن سے کیا مراد ہے:

يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ ○ (السجدہ ۳۲ : ۵)

تو حضرت ابن عباسؓ نے اس شخص سے الٹے سوال کیا' اور یہ دن کون سا ہے' يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ○ (المعارج ۷۰ : ۴)۔ اس پر وہ شخص کہنے لگا' میں یہ پوچھ رہا ہوں تاکہ آپ مجھے بتائیں۔ ابن عباسؓ نے جواب دیا' یہ دو دن ہیں جن کا ذکر خدا نے اپنی کتاب میں کیا ہے' اور خدا ہی ان دنوں کی حقیقت بہتر جانتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے آثارِ صحیحہ کا مطلب یہ ہے کہ سلف صالحین بغیر علم کے تفسیر میں دخل نہیں دیتے تھے۔ لیکن شیخ الاسلام کے نزدیک جس شخص کو لغت و شرع کے اعتبار سے علم حاصل ہو' اس کے لیے تفسیر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ جس طرح سے بے علمی کی وجہ سے سکوت واجب ہے' اسی طرح سے علم ہونے کی صورت میں جواب بھی دینا واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ (آلِ عمران ۳ : ۱۸۷)۔ اس آیتِ کریمہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس شخص کے پاس قرآن کا علم ہو وہ اس کو لوگوں کے سامنے بیان کرے۔ آیات کی وضاحت اور ان کی تفسیر کو چھپانے کی صورت میں وہ کتمانِ علم کے مجرمین کی فہرست میں آتا ہے۔ ان کے بارے میں اللہ کے رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا "جس شخص سے علم کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے اور وہ علم کو چھپاتا ہے' قیامت کے دن اس کے منہ میں آتشیں لگام دی جائے گی۔ لیکن جس آیت کی تفسیر نہ معلوم ہو اس کی تفسیر ہرگز نہ بیان کرنی چاہیے' کیونکہ ایسا شخص بھی جہنم کا مستحق ہوگا۔

دعوتِ دین اور اشاعتِ اسلام کی راہ میں ہونے والی ہر جدوجہد کا راستہ فہمِ قرآن سے گزرتا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی تمام عالمی اسلامی تحریکات نے توحید و مساوات کے عالمگیر اسلامی اصول کی طرف رجوع کا جو پیغام دیا ہے اس میں انھوں نے قرآن کریم سے براہِ راست استفادہ پر سب سے زیادہ زور دیا۔ علامہ محمد عبدالوہابؒ' سید احمد شہیدؒ' حاجی شریعت اللہؒ' شیخ محمد بن علی

السنوسیؒ، عثمان دان فودیوؒ سے لے کر امام حسن البناؒ، سید قطب شہیدؒ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تک تمام مفکرینِ اسلام و بانیانِ تحریکاتِ اسلام نے اپنی اپنی تحریروں میں افہام و تفہیمِ قرآن پر بطورِ خاص توجہ صرف کی۔ آج کارکنانِ تحریک کو فہمِ قرآن کے ان اصولوں کے مطابق قرآن کریم سے براہِ راست رابطہ استوار کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انقلابِ اسلامی کا کوئی خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

ایمان کی حقیقت

اقرار باللّسان

مولانا بدر عالم میرٹھیؒ

اشیا کے وجود کی تین صورتیں

کسی چیز کے وجود کی عالم میں تین صورتیں ہو سکتی ہیں: ۱- لفظی۔ ۲- ذہنی۔ ۳- عینی۔

ان ہر سہ اصناف میں لفظی وجود سب سے ضعیف اور کمزور وجود ہے۔ جو مقاصد و اغراض کسی شے کے وجود میں ملحوظ ہو سکتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی اس وجود پر مرتب نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر اس وجود کو عدم کے برابر کہہ دیا جائے تو بے جا نہیں ہے۔ پانی کا لفظی وجود کسی تشنہ کی پیاس نہیں بجھاتا، اور نہ روٹی کا صرف زبانی تذکرہ کسی بھوکے کا پیٹ بھرتا ہے۔

وجودِ ذہنی گو لفظی وجود سے قوی تر ہے، مگر شے کے تمام آثار و احکام مرتب ہونے کے لیے یہ بھی ناکافی ہے۔

وجودِ عینی وہ وجود ہے جو خارج میں کسی کے اعتبار کیے بغیر موجود ہوتا ہے۔ اسی وجود کو درحقیقت وجود کہا جاسکتا ہے۔ بقیہ اصناف اس کے توابع اور فروع ہیں۔ یہی مبدءِ آثار ہے، اور اسی پر شے کے سب احکام مرتب ہوتے ہیں۔ آنکھوں کی تر و تازگی، قلب و جگر کی سیرابی، اشجار و اثمار کی سرسبزی، یہ سب پانی کے وجودِ عینی ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اسی لیے جب کوئی پیاسا پانی مانگتا ہے تو اس کا مقصد پانی کا یہی عینی وجود سمجھا جاتا ہے، اور اس کا لفظی یا ذہنی وجود کسی کے خواب و خیال میں نہیں آتا۔

اسی طرح ایمان کے وجود کی بھی تین صورتیں ہیں: لفظی، ذہنی، عینی۔

ایمان کا وجودِ لفظی

سابق تمہید کی بنا پر ایمان کا لفظی وجود بیکارِ محض ہونا چاہیے۔ جب کسی تشنہ کے لیے پانی کا

صرف لفظی وجود کارآمد نہیں ہوتا تو' انبیا علیہم السلام کی دعوت کے جواب میں' ایمان کا صرف لفظی وجود کیا مفید ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں ایک سخت مشکل یہ درپیش ہے کہ عالمِ بشریت کی سرتا سر محتاجی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو الفاظ و حروف کا جامہ پہنائے بغیر ادا کر سکے۔ اس کی قلبی ترجمانی کا یہی ایک ناتمام آلہ ہے۔ اگر وہ بھی ناقابلِ اعتبار ٹھہرے' تو عالمِ انسانی کا تمام کاروبار معطل اور بیکارِ محض ہو جائے۔ اس لیے چاروناچار ایمان کا لفظی وجود بھی شریعت میں ایک حد تک قابلِ اعتبار سمجھا گیا ہے۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ۔

میں اس بات پر مامور ہوں کہ جب تک کفار لا الٰہ الا اللہ نہ کہیں' ان سے جنگ جاری رکھوں۔

اب اسے ایمان کی رفعت اور بلندی کہیے' یا اس کی فیاضی سے تعبیر کیجیے' کہ محض زبانی کلمۂ توحید پر اس نے جان بخشی کا اعلان کر دیا ہے اور کسی کے دل کے اندر کی کیفیت سے کوئی بحث نہیں کی۔

اس جگہ یہ دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ اسلام میں تصدیقِ قلبی کے بغیر' صرف زبانی اقرار کر لینا بھی کوئی وزن رکھتا ہے' کیونکہ قلبی تصدیق ایمان کا وہ اہم رکن ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی' کسی حالت میں' قطعِ نظر کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ حتیٰ کہ ' بحالتِ اکراہ جبکہ اپنی جان پر بن رہی ہو' زبان سے کلمۂ کفر ادا کرنے کی صرف اسی شرط سے اجازت دے دی گئی ہے کہ قلب کی گہرائیاں اذعان و ایقان سے لبریز اور معمور رہیں۔

اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ (النحل ۱۶:۱۰۶)

مگر وہ شخص جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا دل ایمان پر برقرار ہے۔

جو صورت حدیث میں مذکور ہے' وہ یہ ہے کہ اگر زبان اقرار کر لیتی ہے' اور دوسری کوئی دلیل' جو قلبی انحراف پر دلالت کر سکے' ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتی' تو اس وقت ہم اس بات کے مامور ہیں کہ اس اقرار ہی کو قلبی تصدیق کی دلیل سمجھیں۔

اسلام' جو اخلاقِ عالیہ کا سب سے اوّل معلم ہے' کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے جیسے ایک انسان کی زبان کو بلا وجہ جھوٹا قرار دے' یا اس کے متعلق' کسی اندرونی کمزوری کی بنا پر' اپنے ضمیر کے خلاف بولنے کا تصور لائے۔ دنیا میں ایک بڑے سے بڑا انسان' خواہ اخلاق کے کتنے ہی بلند مقام تک کیوں نہ پہنچ چکا ہو' کبھی اپنے حریف پر' وہ بھی بحالتِ جنگ' اعتماد کا خیال نہیں

کر سکتا۔ یہ اسلام ہے' جو یہ دعوت دیتا ہے کہ تم اپنے حریفوں کی زبان پر بھی اعتماد کر لو' اور اس تشویش میں نہ پڑو کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔ اگر ان میں کوئی سعید روح ہوگی' تو ایک دن وہ خود بخود اپنے اس صدق نما کذب پر نادم ہوگی' اور دل بھی زبان کی طرح اسلام کا کلمہ پڑھ لینے پر مجبور ہو جائے گا۔

ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے ایک کافر کو بکریاں چراتے دیکھا۔ دورانِ جنگ میں ایک فریق دوسرے فریق کی گھات میں لگا ہی رہتا ہے۔ صحابہؓ نے ارادہ کیا کہ اس کی بکریاں چھین لیں۔ اس نے اپنا پانسا کمزور دیکھا۔ وہ وقت آگیا کہ جو اسلام مدت سے اس کے سینہ میں گھوم رہا تھا اب دل میں اتر آئے۔ وہ اسلام لے آیا۔ مگر اس حال میں دشمن کا اقرارِ وفاداری' انسان کی کمزور فطرت کب قبول کرتی۔ اس لیے صحابہ کرامؓ نے اس اسلام کو صرف مال کے بچاؤ کا ایک ذریعہ سمجھا' اور اس کی بکریاں غنیمت کا مال بنا لی گئیں۔ لیکن اسلام' جو اخلاق کی آخری منازل صرف زبانی سکھانے نہیں آیا تھا بلکہ طے کرانے آیا تھا' اس کمزوری کو کب برداشت کر تک۔ اس واقعہ کی اہمیت محسوس کی گئی' اور اتنی کی گئی کہ وحی الٰہی کو دخل دینا پڑا' اور نہایت تنبیہہ آمیز لہجہ میں ارشاد ہوا :

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (النساء ۴ : ۹۴)

اور مت کہو اس شخص کو' جو تم سے "سلام علیک" کرے' کہ تو مسلمان نہیں۔ تم چاہتے ہو اسباب دنیا کی زندگی کا۔

کتبِ احادیث میں اس قسم کے واقعات ایک دو نہیں' بہت ہیں' جہاں اسلام کے لفظی وجود' یعنی صرف اقرار باللسان کو دنیوی احکام کے لیے کافی سمجھا گیا ہے۔

حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ یا رسول اللہؐ" اگر دورانِ جنگ میں دشمن میرا ایک بازو کاٹ دے' اور جب میرا موقعہ لگے تو وہ جان بچا کر درخت کی آڑ میں آجائے' اور کلمۂ شہادت پڑھ لے' تو کیا میں اس کے اس مجرمانہ اقدام کے بعد بھی اس کا یہ متہم اسلام قبول کر لوں ؟ ارشاد ہوا' ضرور۔ اور اگر اس کے بعد بھی تم نے اسے قتل کر دیا' تو یاد رکھنا' تم اب اسی طرح مباح الدم سمجھے جاؤ گے جیسا وہ اپنے اسلام لانے سے قبل مباح الدم تھا (مسلم شریف)۔

دیکھو' یہاں بھی انسان کی کمزور فطرت کس طرح اپنے حریف کا اسلام متہم کر رہی ہے' اور چاہتی ہے کہ اس کے انتقام میں یہ لفظی اسلام حائل نہ ہونے پائے۔ مگر یہ اسلام ہے' جو اپنے

ہمنواؤں کے سیکڑوں بازو حریفوں کی ایک زبان پر نثار کر رہا ہے۔ انتقام گو فطری حق سہی، مگر اسلام اس نازک ماحول میں یہ ثابت کر دینا چاہتا ہے کہ ایک کلمۂ حق کے احیا میں وہ اپنے فطری اور ذاتی حق سے بھی دست بردار ہو سکتا ہے۔

اقرارِ وفاداری

احادیث میں کچھ واقعات ایسے بھی نظر سے گزرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دشمنوں کی جان و مال کا تکفل اور ان کی عزت و احترام کا تحفظ، کچھ خاص اس کلمہ کے ادا کرنے ہی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ صرف اقرارِ وفاداری کی ضرورت ہے، خواہ کسی زبان سے ہو اور خواہ کسی عمل سے۔

حضرت خالدؓ مسلمانوں کا ایک دستہ لیے ہوئے مصروفِ جہاد ہیں۔ دشمن چاہتا تھا کہ اسلام قبول کر لے، مگر ناواقفی اور جہالت کی وجہ سے اسلمنا (ہم نے اسلام قبول کیا) کا لفظ نہ کہہ سکا، اور اس کے بجائے صبانا صبانا (یہ لفظ عربی زبان میں بددین ہونے کے لیے مستعمل ہے) کی صدا بلند کرنے لگا۔ اسی کمزوریِ فطرت کی وجہ سے یہاں بھی یہ نازک اسلام قبول نہ ہوا، اور آخر اسی حالت میں سب کو موت کا جام پی لینا پڑا۔ رحمتہ اللعالمینؐ کو جب اطلاع ملی تو انتہا درجہ مضطرب ہوئے، اور اسی اضطراب کے عالم میں دونوں ہاتھ اس تصور میں آسمان کی طرف اٹھ گئے کہ مبادا اللہ تعالیٰ کا قہر ان معصوموں کا انتقام لینے کے لیے کھڑا ہو جائے، اور میں بھی اس میں شامل سمجھا جاؤں۔ اس لیے فرمایا، اے پروردگار، جو غلطی خالد سے سرزد ہوئی، میں اس سے بری ہوں (بخاری)۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہو گیا کہ لفظی وجود گو ضعیف تر بلکہ مرادفِ عدم ہے، پھر اسلام نے اس کا کیوں اعتبار کر لیا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اقرار سے مراد یہاں وہی اقرار ہے جسے ضمیر کی صحیح آواز کہا جا سکے۔ ورنہ اسے اقرار ہی نہ کہا جائے گا، بلکہ وہ انکار کی صرف ایک اقرار نما صورت ہو گی۔ اسلام کے اس لفظی وجود کو فقہا کی اصطلاح میں اقرار باللّسان کہا جاتا ہے۔

اقرار باللّسان

فقہا کو اس میں اختلاف ہے کہ اسلام میں اقرار کی حیثیت کیا رکھنا چاہیے۔ ایک جماعت رکن کی حیثیت تجویز کرتی ہے، اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے۔ پہلی جماعت کا خیال ہے کہ اقرار بھی ایک نوع کی تصدیق ہی کا نام ہے۔ فرق ہے تو یہ کہ ایک تصدیق قلب سے ہوتی ہے، اور اقرار، زبان کی تصدیق ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ تصدیق کی ایک نوع رکن

اور دوسری شرط قرار دے دی جائے۔ یہ اور بات ہے کہ تصدیقِ قلبی رکنِ اصلی ہے، یعنی کسی حالت میں یہاں تساہل برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اور اقرار، رکنِ زائد، یعنی بعض صورتوں میں یہاں اغماض و چشم پوشی کرلینا بھی ممکن ہے، جیساکہ اکراہ میں۔

شیخ ابو منصور ماتریدی، شیخ ابوالحسن اشعری، اور امام نسفی کا میلانِ خاطر اقرار کی شرطیت کی طرف ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ثبوتِ اسلام سے قبل ہی احکامِ اسلام کا نافذ کردینا تو غیر معقول ہے، اور زبانی اقرار کیے بغیر ہمارے پاس اسلام پر کوئی شہادت نہیں۔ اس لیے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ نفاذِ احکامِ اسلامیہ کے لیے اقرار باللّسان کو شرط کہا جائے۔

علامہ تفتازانی فرماتے ہیں کہ اگر اس اقرار کا صرف یہ مقصد ہے، تو تنہائی کا اقرار کافی نہ ہونا چاہیے، بلکہ کم از کم مسلمانوں کے امیر کے سامنے ہونا چاہیے، تاکہ اجراءِ احکام کا اصل مقصد حاصل ہو سکے۔ اس امر پر فریقین کا اتفاق ہے کہ مطالبہ کے بعد زبان سے اقرار کرنا بہرکیف ضروری ہے، کیونکہ اب اقرار نہ کرنے کے معنی گویا انکار کرنا ہیں۔ یہ کفرِ جحود کہلاتا ہے۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ (النمل ۲۷ : ۱۴)

اور انکار کیا ان (آیات) کا، حالانکہ اپنے دل میں اس کا یقین کر چکے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کبھی دل اندر سے یقین کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے، مگر زبان انکار سے باز نہیں آتی۔ اس کا نام اصطلاح میں کفرِ عناد ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ فرماتے تھے کہ ہمارے فقہا نے ایمان کی تعریف میں اسی لیے اقرار کا اضافہ کردیا ہے کہ جو تصدیقِ قلبی زبانی انکار کے ساتھ ہو وہ ایمان کی تعریف میں داخل نہ رہے، اور یہ سمجھا ہے کہ جب زبان کے لیے اقرار کرنا لازم ہو جائے گا، تو اب انکار کی گنجائش ہی نہیں ہوگی۔

حافظ ابنِ تیمیہؒ نے اس کو دوسری طرح ادا کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ، جب تک اقرار نہ ہو، ہمارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس کے قلب میں حقیقتہ" تصدیق موجود ہے۔ لہٰذا اگر ایک شخص مطالبہ کے بعد بھی اقرار نہیں کرتا، تو ہم اسی پر محمول کریں گے کہ اس کو تصدیقِ قلبی حاصل نہیں ہے۔ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ اقرار باللّسان ایمان کا جزو قرار دیا جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر اقرار کرنا اسی مقصد کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے، جو حضرت استاذ مرحوم کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، تو پھر رکنیت اور شرطیت کا اختلاف بہت بڑھانا نہ چاہیے۔ بلکہ اب مناسب یہ ہے کہ اختلاف کی تنقیح یوں کر دی جائے کہ اقرار کرنا بالاتفاق ضروری ہے، مگر ایک فریق نے اس کی اہمیت زیادہ محسوس کر کے رکنیت کا لفظ کہہ دیا ہے، اور دوسری جماعت نے گو

اہمیت کو تسلیم کیا ہے مگر رکنیت کا لفظ نہیں کہا۔ پھر اگر پہلے فریق نے رکن کہا ہے' تو لفظ زائد کہہ کر اسے ذرا پھیکا بھی کردیا ہے۔

حافظ ابنِ تیمیہؒ یہاں ایک اور مفید تحقیق فرما گئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اقرار کے دو معنی آتے ہیں' زبان سے تصدیق کرنا اور التزامِ طاعت اور عہدِ عمل و فرمانبرداری۔ آیتِ ذیل میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں :

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِکُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ
(آلِ عمران ۳ : ۸۱)

اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاؑ سے عہد لیا کہ' جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم' پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے کہ سچا بتائے تمھارے پاس والی کتاب کو' تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا' کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا۔ وہ بولے' ہم نے اقرار کیا۔

اس آیت میں اقرار کا لفظ عہدِ عمل اور التزامِ طاعت ہی کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ یہاں انبیاؑ سے کسی امر کی صرف تصدیق مطلوب نہیں' بلکہ اس کا عہد لیا جارہا ہے کہ جو رسول تمھارے پاس آئے گا تمھیں اس کی اطاعت کرنا ہوگی' اس پر ایمان لانا ہوگا' اس کی نصرت کرنی پڑے گی۔ التزامِ طاعت کا بھی یہی مفہوم ہے۔ اب اگر اقرار سے یہ معنی مراد لے لیے جائیں' تو ایمان کی تعریف میں صرف اقرار کی قید کافی ہوگی' ورنہ التزامِ طاعت کے تیسرے رکن کا اضافہ کرنا ضروری ہوگا۔

۱ - حافظ ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کے ثبوت کا دارومدار کسی ایسی ہی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم یکساں طور پر سب کو ہو سکے۔ اگر خدا کے رسول کے علم پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیا جاتا تو یقیناً منافقین کا گروہ' کفار میں شمار ہوتا۔ اب اگر ان کو قتل کیا جاتا تو انھیں ناحق یہ بدنام کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا کہ آپؐ اپنے اصحاب و رفقا کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ اس لیے کلمۂ توحید کا زبانی اقرار ہی اسلام قبول کرنے کا معیار قرار دے دیا گیا اور اسی ایک کلمہ پر جنگ کے آغاز و خاتمہ کا دارومدار رکھ دیا گیا(کتاب الایمان' ص ۱۷۳)۔

تزکیہ وتربیت

وفاشعاری کے دو نادر نمونے

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

۱۔ حجاج بن یوسف

طائف کے مکتب خانے میں بچوں کو پڑھاتا تھا' لیکن معلم الصبیانی کے اس پیشہ سے اتنی آمدنی جو ضروریات کے لیے کافی ہوتی' نہیں ہوتی تھی۔ پھر کیا کیا جائے۔ طائف سے اٹھا' دمشق پہنچا۔ وقت کے حکمراں کا جو وزیرِ باتدبیر تھا' اس کے باڈی گارڈ کے سپاہیوں میں بھرتی ہو گیا۔ وزیر کا نام روح بن زنباع تھا۔ مروانی حکومت کے پہلے حکمران عبدالملک بن مروان نے روح کو اپنا وزیر بنا لیا تھا۔ بھرتی ہونے والا سپاہی' یوسف ثقفی باشندۂ طائف کا لڑکا تھا۔ نام اس کا حجاج تھا۔ یہ وہی حجاج ہے' جس کی یاد کو مسلمان اپنے حافظہ سے مٹانا چاہتے ہیں' لیکن بجائے مٹنے کے وہ تازہ ہی ہوتی رہتی ہے۔ امتِ اسلامی کے جگر کا وہ گھاؤ ہے جو صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اسی طرح ہرا ہے' نہ اس کی ٹیس ہی کم ہوتی ہے اور نہ دکھ ہی اس کا بھلایا جا سکتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے:

> دنیا کی ہر قوم اپنے اپنے فرعونوں کو لے کر کھڑی ہو' اور ان سارے فرعونوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی طرف سے حجاج اگر پیش کر دیا جائے تو مسلمانوں کا یہ فرعون سب پر بھاری ہو جائے گا۔ (ابنِ عساکر' ج ۴' ص ۸۰)

مگر باوجود بے دینی اور حد سے گزری ہوئی بے دینی کے' یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے مورخین نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بے آئینی کا الزام حجاج پر مشکل ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ غلط ہو یا صحیح' لیکن ایک ضابطہ اور آئین کو طے کر لینے کے بعد کرتا تھا جو کچھ بھی وہ کرتا تھا۔ اس کا شاید یہ فطری رجحان تھا کہ' وقت کی حکومت خواہ کسی طرح قائم ہو گئی ہو' رعایا کو چاہیے کہ بے چون و چرا اس کے احکام کی پابندی کرے' ظاہراً و باطناً" اس کی

وفادار رہے۔ وہ اپنے نزدیک سمجھتا تھا کہ قرآنی آیت فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا ' ڈرو اللہ سے' جہاں تک تمہارے بس میں ہو' سنو اور فرمان بردار بنے رہو (التغابن ۶۴ : ۱۶) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈرنے کے لیے استطاعت کی شرط لگا دی گئی ہے ـــــ یعنی جہاں تک آدمی کے بس میں ہو خدا سے ڈرے ـــــ لیکن حکومت کے احکام کے متعلق صرف یہی حکم دیا گیا ہے کہ سننے والے ان کو سنیں' اور بے چون و چرا اس کے فرمانبردار بنے رہیں۔ اسی لیے کہتا تھا کہ میں جو حکومت کا نمائندہ ہوں' اگر حکم دوں کہ لوگ مسجد کے فلاں دروازے سے نکلیں' اس حکم کے بعد بھی کسی دوسرے دروازے سے جو نکلے گا میرے لیے اس کا خون بھی حلال ہو جائے گا اور اس کا مال بھی۔ یہی وہ کہتا بھی تھا' اور اس کے مطابق عمل بھی کرتا تھا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کے سامنے ایک صاحب' عنبسہ بن سعید نامی نے اپنی بعض چشم دید شہادتیں بیان کی تھیں۔ حجاج نے حکم دے رکھا تھا کہ رات میں کسی کو کوفہ کی گلیوں اور سڑکوں پر فلاں وقت سے صبح تک نکلنے کی اجازت نہیں۔ گویا کرفیو آرڈر نافذ کر دیا گیا تھا۔ عنبسہ کہتے ہیں کہ صرف ایک رات جب میں حجاج کے پاس بیٹھا تھا' لوگ گرفتار ہو ہو کر آتے تھے' بے چارے وجہ بھی بتاتے' لیکن کسی کی شنوائی نہ ہوتی' اور یہ کہتے ہوئے کہ ـــــ ہم تم کو منع کرتے ہیں اور تم ہماری نافرمانی کرتے ہو ـــــ حجاج حکم دے دیتا کہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔ بے چارے قتل کر دیے جاتے تھے۔ حجاج نے اپنے عہدِ حکومت میں واسط نامی شہر آباد کیا تھا۔ اس میں میونسپلٹی کا قانون نافذ تھا' بر سرِ راہ پیشاب کرنے والوں کی سزا حبسِ دوام تھی۔

حکومت کے ساتھ وفاداری کے اسی جذبہ کی شدت نے ترقی کی راہ بھی اس کے لیے ہموار کی تھی۔ جس زمانے میں عبدالملک کے وزیر کے باڈی گارڈ کا حجاج سپاہی تھا' وزیر نے یہ کہتے ہوئے عبدالملک کے سامنے پیش کیا تھا کہ نظم و ضبط کے قائم کرنے میں میرا خیال ہے کہ اس شخص سے آپ کو مدد ملے گی۔ عبدالملک سفر میں تھا۔ حجاج کو حکم دیا کہ جس وقت میں سوار ہو جاؤں تم اس کی نگرانی کرو کہ کوئی میرے سوار ہونے کے بعد بیٹھا نہ رہے۔ حکم سن کر حجاج چلا گیا۔ کوچ کا نقارہ بجا۔ حجاج بھی سب کو سوار ہونے کا حکم دے رہا تھا اور لوگ سوار ہوتے چلے جاتے تھے۔ لیکن جب وزیر کے ان ہی آدمیوں کے سامنے آیا جن میں کا ایک سپاہی وہ بھی تھا' تو لوگوں نے اس سے کہا کہ آؤ' ابھی کچھ کھا پی لیں تب روانہ ہوں گے۔ یہ سننا تھا کہ حجاج نے ایک ایک کی پیٹھ کوڑے سے پھاڑ دی' اور وزیر کے خیمہ میں آگ لگا دی۔ یہ خبر وزیر نے خود روتے ہوئے عبدالملک تک پہنچائی۔ حجاج بلایا گیا تو "یہ کیا کیا" کے جواب میں جس وقت وہ کہہ

رہا تھا"۔ "امیرالمومنین! میں نے تو کچھ نہیں کیا' میرا کوڑا میرا کوڑا نہیں آپ کا کوڑا تھا' میرا ہاتھ میرا ہاتھ نہیں آپ کا ہاتھ تھا" (الیافعی)' عبدالملک کی باچھیں کھل گئیں' جس آدمی کی تلاش تھی گویا وہی اس کو مل گیا۔ ترقیوں کی راہ حجاج پر کھل گئی۔

پہلے حجاز کا گورنر ہوا' اور عبدالملک کی وفاداری میں عبداللہ بن زبیرؓ صحابی کو صحنِ کعبہ میں شہید کیا۔ کعبہ تک میں آگ لگنے کی پرواہ اس نے عبدالملک کے حکم کے مقابلہ میں نہ کی۔ تب عراق اور خراسان کی گورنری سے سرفراز ہوا۔ گیارہ سال تک عبدالملک کی حکومت میں' اور عبدالملک کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے اور جانشین ولید کے زمانہ میں نو سال تک' مروانی حکومت کے سب سے بڑے علاقہ میں حکومت کرتا رہا۔

اسی زمانہ میں' دو سال کی مدت میں' واسط کا شہر کوفہ اور بصرہ کے درمیان اس نے تعمیر کیا۔ یہ اس زمانہ میں دنیا کے حسین ترین شہروں میں شمار ہوتا تھا' اور خضراءِ واسط یعنی واسط کے سبزہ زار کے نام سے مشہور تھا' جسے دیکھ کر' لکھا ہے' بے ساختہ زبانوں پر قرآنی آیت --- ہر ٹیلے پر نشانی کی عمارتیں' جن کا کوئی فائدہ نہیں' کھڑی کرتے ہو' اور ایسے مکانات تعمیر کرتے ہو' کہ شاید تم ہمیشہ دنیا میں رہو گے --- آجاتی تھی۔

معلم الصبیان کے مکتب خانے سے نکل کر عراق وایران' خراسان جیسے ممالک کی حکومت تک پہنچنے کے بعد بھی' حکومت کے ساتھ وفاداری کا جذبہ حجاج کا ترقی پذیر ہی تھا۔ اس نے بڑے بڑوں کی بھی اس راہ میں پرواہ نہ کی۔ جنگ کے یا لڑائی کے مقتولوں کے سوا' اس راہ میں' بیان کیا گیا ہے کہ' ایک لاکھ بیس ہزار تعداد حجاج کے ان مقتولوں کی ہے جو اس کے سامنے باندھ کر قتل کیے گئے۔ اور جیل خانے سے حجاج کے مرنے کے بعد "۸۱ ہزار قیدیوں کو رہائی بخشی گئی' جن میں ۳۳ ہزار تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنھوں نے نہ چوری کی تھی اور نہ کوئی ایسا جرم کیا تھا جس کی سزا سولی وغیرہ ہو"۔ (ابنِ عساکر' ج۴' ص ۸۰)

حکومت کے حکم سے بال برابر تجاوز اس کے نزدیک قتل و حبس کا مستحق لوگوں کو بنا دیتا تھا۔ اس سلسلہ میں جو کچھ بھی اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے بظاہر اس سے انکار کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ قانون بنا لینے کے بعد جو فعل بھی کیا جائے آئینی بن جاتا ہے' یہی اس کا خیال بھی تھا۔ پوچھنے والے نے ایک دفعہ اس سے پوچھا بھی کہ اپنے ضمیر میں تم اپنی خونریزیوں اور سفاکیوں کے متعلق کسی قسم کی خلش بھی محسوس کرتے ہو۔ جواب میں اس نے کہا تھا: "لبنان اور سینیر (شام کے دو پہاڑوں) کے برابر سونا خیرات کرنے سے زیادہ میں ثواب کا کام اپنے ان اعمال وافعال

کو سمجھ رہا ہوں جو حکومت کی فرمانبرداری اور وفاشعاری کے سلسلہ میں مجھ سے اب تک بن پڑے ہیں۔" (ابن عساکر' ج ۴' ص ۶۸)

اس راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی صحابیت کے شرف کی بھی پرواہ نہ کرتا تھا۔ حضرت انس بن مالکؓ کی گردن میں' جیسا کہ مشہور ہے' اس نے مہر لگائی تھی' جو علامت تھی اس بات کی کہ ان کی وفاداری مشکوک ہے۔ اس نے بڑے جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن جبیرؒ کو بے دردی اور قساوتِ قلبی سے قتل کیا۔ عام طور سے اس دور کی داستان کو لوگ بیان کرتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ کچھ ایسے خواب دیکھنے لگا کہ جو اس کی موت کی خبر دے رہے تھے۔ مگر بایں ہمہ' اس نے اس کے بعد بھی جو وصیت نامہ لکھوایا تھا' وہ یہ تھا: "حجاج' یوسف کا بیٹا' (مرنے کے وقت) یہ وصیت نامہ لکھوا رہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے' اس کی بھی میں گواہی دیتا ہوں' اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم' اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول ہیں۔"

اس رسمی تمہیدی فقرے کے بعد "وصیت نامہ" کے الفاظ یہ تھے:

انہ لا یعرف الا طاعۃ الولید بن عبد الملک علیہا یحیا وعلیہا یموت و علیہا یبعث۔

(ابن عساکر' ج ۴' ص ۶۸)

اور حجاج' ولید بن عبدالملک (وقت کے حکمراں) کی اطاعت وفرمانبرداری کے سوا اور کچھ نہیں جانتا۔ اسی پر وہ زندہ رہا' اسی پر مرے گا' اور اسی پر قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔

اور اس سے بھی دلچسپ لطیفہ "ضمیری مغالطہ" کا یہ ہے۔ حجاج ایک دفعہ بیمار ہوا' اور اتنا سخت بیمار کہ کوفہ میں اس کے مرنے کی خبر مشہور ہو گئی۔ قدرتاً لوگوں نے اطمینان کی سانس لی۔ مگر بجائے مرنے کے حجاج چنگا ہو گیا۔ جمعہ کے دن منبر پر آ کر اس نے تقریر کی' جس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ "تم نے مشہور کر دیا کہ حجاج مر گیا۔ خدا کی قسم اپنے متعلق ہر طرح کی بہتری اور بھلائی کی امید مجھے اپنی موت ہی سے ہے۔" (ابن عساکر' ج ۴' ص ۸۲)

اسی لیے پسند بھی وہ ان ہی لوگوں کو کرتا تھا جو حکومت کے مفاد کی حفاظت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتے تھے' اور اس راہ میں سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ اصفہان کا گورنر بنا کر حجاج نے ایک بدوی عرب کو اس لیے بھیجا کہ خراج کا بقایا سالہا سال سے اصفہان والوں پر چڑھا چلا آتا تھا' وصول نہیں ہوتا تھا۔ المسعودی نے لکھا ہے کہ اصفہان پہنچ کر نمبرداران اور

مقدموں کو گورنر نے جمع کیا۔ آٹھ مہینوں کی مہلت ان لوگوں نے طلب کی۔ اس نے بجائے آٹھ کے دس مہینے تک کی مہلت دیتے ہوئے کہا کہ دس آدمیوں کی ضمانت پیش کرو۔ ضمانت لینے والوں نے ضمانت دے دی۔ مقررہ مدت تک رقم جب وصول نہ ہوئی' تو ضمانت دینے والوں کو طلب کرکے' اس گورنر نے حکم دیا کہ خالی تھیلیاں خزانے سے لائی جائیں' اور ان ضمانت دینے والوں میں سے ایک ایک کو منڈی کاٹ کاٹ کر تھیلی بھری جائے۔ حکم کے مطابق ابھی دو ایک منڈیوں تک نوبت پہنچی تھی۔ تھیلیاں جو بھری گئیں' اور منہ ان کا بند کر دیا گیا تھا' مہر لگائی گئی' اور پشت پر گورنر نے لکھا: "فلاں ابن فلاں کے ذمہ جتنی رقم واجب الادا تھی وہ وصول ہو گئی۔" لوگوں میں ہلچل مچ گئی اور چند گھنٹوں میں سالہا سال کا بقایا وصول ہو گیا۔

حجاج تک وصولی کرنے کے اس طریقہ کی خبر جب پہنچی تو اپنے انتخاب کی داد خود دے رہا تھا۔ لکھا ہے کہ جب تک حجاج زندہ رہا' اصفہان پر اس کا یہی بدوی گورنر مسلط رہا۔ حالانکہ بداوت میں حال اس کا یہ تھا کہ چار درہم دے کر حجاج نے حکم دیا کہ تین آدمیوں پر اس کو تقسیم کر دو۔ تین درہم تک تو حساب صاف تھا لیکن چوتھے درہم کو کیا کرے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ (المسعودی' ص ۱۰۴)

اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ "ضمیر" کو دینی حدود سے آزاد کر دینے کے بعد بآسانی دھوکہ دیا جا سکتا ہے۔ حجاج کی زندگی اس مغالطہ کی ایک عبرتناک تاریخی مثال ہے۔ وہ دین کا نہیں بلکہ آئین کا پابند بن کر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ ظاہر ہے کہ آئین کے بنانے والے خود انسانی عقول اور دماغ ہوتے ہیں۔ اپنی خواہش کے مطابق عقل اور دماغ سے مشورہ حاصل کرنا کچھ بھی مشکل نہیں۔ دین کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا سرچشمہ عقل ودماغ نہیں بلکہ عقل و دماغ کے خالق حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذاتِ پاک ہوتی ہے۔ اس لیے شعوری اور غیر شعوری خواہشوں کی آلودگیوں سے دین کے دفعات پاک ہوتے ہیں۔

حجاج نے حکومت کی بہی خواہی اور وفاداری کے سلسلہ میں یہ واقعہ ہے کہ وہ سب کیا جو وہ کر سکتا تھا۔ دین کے ساتھ' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ' اسی نصب العین پر اپنی دنیا بھی اس نے قربان کر دی تھی۔ ابنِ عساکر نے لکھا ہے: "حجاج جب مرا تو اس نے نہ چھوڑا مگر صرف تین سو درہم (نقد کی شکل میں)۔ ان کے سوا ایک قرآن' ایک تلوار' ایک زین' ایک کجاوہ اور سو عدد زرہیں جو جنگ کے لیے وقف تھیں۔" (ج ۴' ص ۸۱)

اس کا خیال تھا' اور "کلیتہ" بے بنیاد خیال نہ تھا کہ' اسلام کی وجہ سے دولت و ثروت کا جو

طوفان عربوں میں امنڈ پڑا تھا اس نے عربی قبائل اور ان کے منچلے شیوخ کے قلوب میں طرح طرح کی امنگیں پیدا کر دی تھیں۔ ابتدا تو ان کی عہد نبوت ہی میں ہو چکی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں تنبی (زبردستی جھوٹی نبوت) کے دعوے کرنے والے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے بعد حکومت کے باغیوں کا ایک طویل الذیل سلسلہ تھا جو کسی طرح رکتا ہی نہ تھا۔ اسلامی تاریخوں میں حکومت کے ان ہی باغیوں کو الخوارج کہتے تھے۔ دس لاکھ مربع میل بادیہ عرب کے مختلف حصوں میں طرح طرح کے لوگ تھے۔ ان کی نظر اسلامی فتوحات پر جب پڑی' اور یہ محسوس ہوا کہ بظاہر عربی فوجوں کے یہ کارنامے ہیں' تو طرح طرح کے خیالات ان میں پیدا ہونے لگے: "آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی"۔

قسمت آزمائی کے میدان میں لوگ اترنے لگے۔ ان میں عجیب و غریب صلاحیتوں کے لوگ تھے۔ علاقہ نجد کے ایک خارجی ڈاکو جحدر کے متعلق لکھا ہے کہ گرفتار ہو کر حجاج کے پاس وہ لایا گیا۔ اس کی صلاحیتوں کو دیکھ کر حجاج مبہوت سا رہ گیا۔ ایک بھوکے شیر سے حجاج نے مقابلہ کا حکم دیا۔ ابن عساکر کی روایت ہے کہ جحدر ڈاکو کا سیدھا ہاتھ بیڑیوں سے جکڑا ہوا تھا' صرف بایاں ہاتھ کھلا ہوا تھا' تلوار اسی ہاتھ میں تھی۔ شیر چھوڑا گیا۔ حجاج جھروکے سے دیکھ رہا تھا۔ شیر جحدر پر جھپٹا۔ اس نے تلوار پر اس کو روکتے ہوئے ایسی ضرب لگائی کہ "شیر چکرا کر اس طریقہ سے گر پڑا' جیسے آندھی نے کسی خیمہ کو اکھاڑ کر زمین پر گرا دیا ہو"۔ (ص ۶۴)

جس کے بائیں ہاتھ میں اتنی قوت تھی اور جیوٹ کا حال جس کے یہ تھا کہ ایسی حالت میں بھی غضبناک بھوکے شیر سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا' اندازہ کیجیے کہ امکانات کے کیسے کیسے طلسمی ایوان اس کے دل و دماغ میں تیار ہوتے ہوں گے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ جحدر جیسے خارجی اور باغی کتنے تھے۔ حجاج بیخ و بنیاد سے ان عناصر کو ختم کر دینے کا تہیہ کر چکا تھا۔ کہتے ہیں کہ کوفہ اور بصرہ کے قرا (یعنی علما) کی اکثریت' ابن اشعث کو لیڈر بنا کر حجاج کے مقابلہ میں جب کھڑی ہوئی' تو خواجہ حسن بصریؒ فرماتے تھے:

حجاج ایک قدرتی سزا ہے جسے خدا نے تم لوگوں پر مسلط کیا ہے' تم تلوار سے اللہ کی اس سزا کا مقابلہ مت کرو۔ (ابن عساکر' ج ۴' ص ۴۶)

خود بھی وہ یہی کہتے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حوالے سے ایسی روایتیں نقل کیا کرتے تھے جن سے معلوم ہوتا ہے' کہ کوفہ کے باشندوں کی سرکشیوں سے تنگ آ کر حضرت علیؓ نے بددعا کی تھی:

اے اللہ ان پر ثقیف قبیلہ کے لونڈے (یعنی حجاج) کو مسلط فرما' جو ان کے خون اور ان کے مال کے متعلق جاہلیت کے فیصلے کرے گا۔ (ابنِ عساکر' ج ۴' ص ۷۲)

مطلب خواجہ حسن بصریؒ کا یہی تھا کہ بجائے باہر کے' چاہیے کہ ایسے مواقع میں مسلمان اپنے اندر کو ٹٹولیں۔ باہر کی آگ کو دیکھیں کہ خود ان ہی کے اندر سے تو کہیں بھڑک نہیں اٹھی ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو بات اپنے بس کی ہوتی ہے عموماً اس سے لاپرواہی اختیار کی جاتی ہے اور بظاہر جس کا مقابلہ ناممکن نظر آتا ہے اسی سے مقابلہ کرنے کے لیے لوگ تیار ہو جاتے ہیں۔ ممکنات سے اعراض کرتے ہیں' اور ناممکنات کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ جسے کر سکتے ہیں وہی نہیں کرتے' اور جو نہیں ہو سکتا اسی کے کرنے کی تجویزوں میں اپنا وقت بھی ضائع کرتے ہیں' مال بھی برباد کرتے ہیں' آبرو بھی لٹاتے ہیں اور اپنے خون کو بھی رائیگاں کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ خواجہ حسن بصریؒ کی تلقین عرب کے گرم خون رکھنے والے نوجوانوں کو پسند نہ آئی۔ "اس گنوار پردیسی کی بات کیا ہم مان لیں؟" کہتے ہوئے لوگ آپ کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے۔ حالانکہ اس سے پہلے یہی خواجہ حسن بصریؒ باوجود غیر عربی النسل مسلمان ہونے کے' بصرہ کے سب سے بڑے عالم' سب سے بڑے متقی' پرہیزگار' اور سب سے بہتر تقریر کرنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ مگر ان پر بزدلی کا الزام لگایا گیا۔ جو کچھ ہو سکتا تھا وہ تو نہ کیا گیا اور جو نہیں ہو سکتا تھا اسی کو کرنے کے لیے میدان میں اتر گئے۔ مروانیوں کی بے پناہ فوجی طاقت سے نہتے مسلمانوں کو ٹکراسوایا گیا۔ اس کا جو انجام ہو سکتا تھا وہی ہوا۔ خواجہ حسن بصریؒ ایک طرف عام مسلمانوں کو یہ سمجھاتے سمجھاتے تھکے چلے جاتے تھے کہ تلوار سے یہ مصیبت نہیں ٹلے گی جو تم پر ٹوٹ پڑی ہے بلکہ "اس مصیبت کا مقابلہ چاہیے کہ دعا اور خدا کے حضور نالہ و زاری سے کرو" (ابنِ عساکر' ج ۴' ص ۷۷)۔ دوسری طرف حجاج کو بھی' جب موقع ملتا' یہ نصیحت فرماتے "دیکھنا اللہ کے نیک بندوں سے بچتے رہنا۔" (الیافعی' ج ۱' ص ۱۹۷)

لیکن اس پر تو خون سوار تھا۔ وہ اعلان کیے ہوئے تھا کہ غیر مجرم لوگوں کو مجرموں کے بدلہ میں پکڑوں گا اور وہ لوگوں کو پکڑ رہا تھا' بے دھڑک قتل کر رہا تھا۔ حکومت کے ساتھ جس کی وفاداری میں ہلکا سا شبہ کسی وجہ سے پیدا ہوتا' اس پر علانیہ غداری کا الزام لگا دیا جاتا تھا۔ لوگ مارے جا رہے تھے' قید خانوں میں سڑ رہے تھے' ان کے گھر گرا دیے جاتے تھے' ان کے بچے یتیم' عورتیں بیوہ ہو رہی تھیں۔ لیکن حکومت کی طاقت کو سب کچھ یقین کرتے ہوئے' حجاج بغیر کسی دغدغہ کے سب کچھ کر رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ جیل خانے جو حجاج نے بنائے تھے کسی میں چھت نہ

تھی' کھلے میدانوں میں چاردیواریوں کے اندر گرمی' سردی' رات دن لوگ گزارنے پر مجبور کیے جاتے تھے۔ جو مر جاتے' کتوں کی طرح ان کی لاش پھنکوا دی جاتی تھی۔

یہ سب اس لیے کیا جا رہا تھا کہ اپنی حکومت کی بے پناہ طاقت پر بھی اس کو بھروسہ تھا اور اس کے ساتھ باور کیے ہوئے تھا کہ مروانیوں کی حکومت کے استحکام واستواری کی سیاسی تدبیر بھی یہی ہے۔ بظاہر حجاج کے زمانہ میں حکومت کی قوت میں اضافہ جس طرح سے ہو رہا تھا اس کو دیکھتے ہوئے ہر دیکھنے والا شاید یہی باور کیے ہوئے تھا جو حجاج کا خیال تھا۔ لیکن اچانک واقعات کا رخ بدلنے لگا۔ حجاج نے خواب میں دیکھا کہ اس کی پیشانی سے دونوں آنکھیں اکھڑ کر باہر نکل آئی ہیں۔ بیدار ہونے کے بعد اپنے اس خواب سے کافی متاثر تھا۔ چند ہی دنوں کے بعد اس کے سامنے اس کے بیٹے نے دم توڑ دیا۔ ابھی اس کا جنازہ شاید اٹھا بھی نہ تھا کہ یمن سے قاصد پہنچا۔ خبر لایا کہ حجاج کا بھائی' محمد بن یوسف جو یمن کا گورنر تھا' مر گیا۔ ان جاں گداز دو حادثوں کی خبر سے متاثر ہی تھا کہ دربار میں اتفاقاً کہیں سے ایک نجومی پہنچا۔ حجاج نے پوچھا کہ اس سال کسی والئ ملک کے مرنے کی خبر بھی تیرے زائچہ سے ملتی ہے۔ نجومی نے کہا' ہاں ملتی تو ہے' لیکن میرے حساب سے اس مرنے والے کا نام "کلیب" (کتیا) ہے۔ حجاج چیخ اٹھا: "اسی نام (یعنی کلیب یا میری کتیا کے نام) سے میری ماں مجھے پکارتی تھی۔" (الیافعی' ص ۱۹۴)

اب دنیا حجاج پر اندھیر تھی۔ اسی عرصہ میں حضرت سعید بن جبیرؒ رئیس الصالحین کی شہادت کا حادثہ فاجعہ پیش آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ بڑے بڑے لوگ حجاج کے جور وظلم سے تنگ آکر روپوش ہو چکے تھے۔ خود خواجہ حسن بصریؒ بھی ان ہی لوگوں میں تھے۔ کہتے ہیں کہ سعید بن جبیر کو قتل کرنے کے بعد حجاج پر ایک قسم کے جنون کا دورہ پڑنے لگا۔ نیند میں بھی چیخ اٹھتا: "سعید سعید! تم میرا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟" اور بیداری میں بھی کبھی چلا اٹھتا: "دیکھو دیکھو! سعید مجھے قتل کرنے کے لیے میری طرف چلا آ رہا ہے"۔ سر میں جنون کے ساتھ ساتھ پیٹ میں درد کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور وہی حجاج جس کے متعلق دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ کھاتے ہوئے ہم نے دیکھا تھا کہ "کف دست میں بھر بھر کر روٹی میں مکھن کو لپیٹتا اور ایک لقمہ اس کا بنا لیتا۔" راوی کا بیان ہے کہ ۸۴ لقمے میں نے گنے۔ (ابن عساکر' ج ۴' ص ۷۲)

اللہ اللہ جو مکھن اور روٹی کے لقموں کو بغیر کسی دغدغہ کے یوں ہی ہڑپ کر جاتا تھا' اچانک اسی حجاج کو پایا گیا کہ پیٹ کے درد سے تڑپ رہا ہے' حلق کے پار کوئی چیز اتار نہیں سکتا۔ طبیب نے گوشت کے ایک ٹکڑے میں دھاگا باندھا' اور بولا: "اے امیر! اللہ آپ کو شفا بخشے' ذرا اس

لقمہ کو کسی طرح فرو کرنے کی کوشش کیجیے"۔ بہ مشکل لقمہ فرو ہوا۔ طبیب نے دھاگہ کو پکڑ کر کھینچا، گوشت کا ٹکڑا باہر نکل آیا۔ مگر کس حال کے ساتھ باہر نکلا کہ "بہت سے کیڑے گوشت کے اسی ٹکڑے میں لپٹے ہوئے تھے"۔ (الیافعی، ج ۱، ص ۱۹۵)

طبیب نے عرض کیا: معدے میں سرطان کا پھوڑا ہے جس میں کیڑے پڑ چکے ہیں، درد اور بے چینی اسی کی وجہ سے ہے۔ علاج ہو رہا تھا، لیکن بجائے فائدہ کے ایک نیا قصہ شروع ہوا۔ زخم کی وجہ سے، یا خدا ہی جانتا ہے کیا اسباب تھے، اچانک زمہریر (سخت سردی) کا احساس حجاج میں شدت پذیر ہونے لگا۔ پہلے تو کمبل اڑھا اڑھا کر لوگوں نے اندر سے ابھرنے والی سردی کو دبانا چاہا، لیکن وہ بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔ آخری حال یہ تھا کہ "انگیٹھیاں دہکتے ہوئے انگاروں سے بھری ہوئی چاروں طرف سے حجاج کے لگائی جاتیں مگر کچھ اثر نہ ہوتا، لوگ بدن سے انگیٹھیوں کو اتنا قریب کر دیتے کہ کھال حجاج کی جل اٹھتی، مگر اس کو خبر بھی نہ ہوتی"۔ (الیافعی، ج ۲، ص ۱۹۵)

حالانکہ اسی حجاج کو اسی کوفہ میں دیکھا گیا کہ موسم گرما میں تازہ تازہ بید کی سرسبز شاخوں سے قبہ بنواتا تھا، اور بید کی ان شاخوں کے ساتھ کوئی ایسی تدبیر کی جاتی تھی کہ پھاڑ پھاڑ کر بیچ میں برف کا چورا ان میں بھرا جاتا تھا۔ حجاج اسی قبہ میں آرام کیا کرتا تھا، اور گرمیوں میں سردیوں کا لطف اٹھایا کرتا تھا۔ (ابنِ عساکر، ج ۴، ص ۷۶)

مگر آج اس کے اندر کی سردی کو گرمی سے بدلنے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ بری سے بری بات کو اچھی سے اچھی تعبیروں میں پیش کرنے کی مہارت میں حجاج اپنی آپ نظیر تھا۔ اہم معاملات کو اپنی منہ زوری سے غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنا دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ موت کی پرچھائیاں شروع شروع میں جب اسے محسوس ہوئیں تو کہتا تھا: "اوہ، نہ مرنا اگر کوئی اچھی بات ہوتی تو شیطان کو خدا کبھی اتنی دراز زندگی عطا نہ کرتا۔" (ابنِ عساکر، ص ۸۲)

یعنی ابلیس کی دعا، اَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ (مہلت دیجیے اس دن تک جب لوگ اٹھائے جائیں)، قبول نہ ہوتی۔ مگر "شکمی سرطان" اور زمہریر نے ہوش و حواس اس کے بگاڑ دیے۔ اب نہ اسے حکومت ہی یاد آتی تھی اور نہ حکومت کا وہ حکمراں جس کی اطاعت و فرمانبرداری کو سب کچھ ٹھہرائے ہوئے تھا۔ عبدالملک، جس نے اس کو آگے بڑھایا تھا، تو مر چکا تھا۔ ولید بن عبدالملک کا عہد تھا۔ وصیت نامہ میں اسی لیے ولید کا نام اس نے درج کیا تھا۔ لیکن اب ولید اور اس کی حکمرانی سب خواب و خیال ہو چکی تھی۔

صرف ایک آدمی کو ڈھونڈ رہا تھا' جو اس کے خوف سے روپوش تھے' یعنی خواجہ حسن بصریؒ۔ تلاش کرنے والوں نے آخر حضرت والا کا پتہ چلا لیا۔ عرض کیا گیا کہ حجاج بڑی بیکسی کے ساتھ آپ کو ڈھونڈ رہا ہے۔ آپ باہر نکل آئے۔ جہاں پڑا کراہ رہا تھا' پہنچے۔ دیکھنے کے ساتھ رونے لگا اور گڑگڑا کر کہہ رہا تھا: "حسن! ﷲ میری مشکل آسان ہو' اس کی دعا کر دو۔ دیکھ رہے ہو میں کس حال میں مبتلا ہوں۔" خواجہؒ نے فرمایا: "دیکھ' اللہ کے نیک بندوں کو نہ چھیڑنا' ہمیشہ اس کی تاکید تجھے میں کرتا رہا' لیکن تو نے نہ مانا۔" پھر فرمایا کہ تیرے لیے دعا کروں گا۔ بلبلا کر حجاج نے کہا "حسن! شفا کی نہیں' اب شفا کی بھلا کیا امید ہے۔ تم دعا کرو کہ موت میری تکلیف کا جلد خاتمہ کر دے"۔

آئین بنا لینے کے بعد ہر فعل قانوناً جائز ہو جاتا ہے۔ ضمیر کو اس مغالطہ سے دھوکہ دینے والے پر اب واضح ہوا کہ یہ صرف مغالطہ تھا۔ جب دم نکل رہا تھا' تو لوگوں کا بیان ہے' زبان پر اس کی یہ الفاظ تھے:

اللھم اغفرلی فان الناس یقولون انک لا تفعل۔

یعنی اللہ میرے گناہوں کو بخش دے' لوگ کہتے ہیں کہ تو ایسا نہیں کرے گا۔

اس کی طرف دو شعر بھی منسوب کیے گئے ہیں' جو سکرات کے وقت اس کی زبان پر جاری تھے۔ ترجمہ جن کا یہی ہے: "لوگوں کا فیصلہ ہے کہ میں جہنمی ہوں مگر وہ فیصلہ بے دیکھے کر رہے ہیں' ان کو کیا معلوم کہ بہت بڑے درگزر کرنے والے آمرزگار کے دربار میں حاضر ہو رہا ہوں"۔

اس کی سوانح عمریوں میں تو نہیں لیکن دوسری کتابوں میں نظر سے یہ بھی گزرا ہے' کہ حجاج کی ماں اس کے مرنے کے وقت رو رہی تھی' اور کہتی تھی' ہائے بچے تو نے زندگی بھر یہ کیا کیا۔ کہتے ہیں کہ حجاج نے آنکھیں کھول دیں' اور بولا' ماں' میرا فیصلہ قیامت کے دن اگر تیرے ہاتھ میں دے دیا جائے' تو سب کچھ جاننے کے باوجود میرے ساتھ تو کیا سلوک کرے گی۔ ماں نے کہا' بیٹا' اگر ایسا ہوا تو جہنم میں بھلا اپنے لختِ جگر کو میں جانے دوں گی۔ حجاج نے' خدا ہی جانتا ہے کہ کہاں تک یہ روایت صحیح ہے' ماں سے یہ سن کر کہا تھا کہ "تو ماں' تو مطمئن رہ' جس کے ہاتھ میں میرا فیصلہ ہے' وہ تجھ سے کہیں زیادہ اپنے بندوں پر مہربان اور ترس کھانے والا ارحم الراحمین ہے"۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سیدنا امام جعفر صادقؒ کے سامنے حجاج کے اس آخری فقرے کو کسی نے نقل کیا۔ اپنی جگہ سے آپ اچھل پڑے' اور فرمایا کہ رجاء (امید) کے اسی حال میں اگر وہ مرا ہے

تو کون کہہ سکتا ہے کہ نامراد مرا۔ (اوکمال قال)

بہرحال شکمی سرطان اور زمہریہ کی اس بیماری میں حجاج کا کام تمام ہوگیا اور جس حکومت کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لیے لاکھوں لاکھ انسانوں کے خون کو بے دردی کے ساتھ اس نے بہایا تھا' اپنی ساری قوتوں اور لامحدود وسائل کے باوجود حجاج کی موت کے بعد سال کا ایک چلہ بھی وہی حکومت پورا نہ کرسکی۔ یعنی ۳۷ سال کے اندر اندر مروانیوں کا سارا جاہ و جلال خاک و خون میں مل گیا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ دمشق کے پایہ تخت میں

مروانی حکومت کے نوے شہزادوں کو ایک ساتھ گرز اور لاٹھیوں سے مار مار کر زمین پر لٹا دیا گیا تھا اور ان ہی کی نیم مردہ لاشوں پر چرمی دسترخوان بچھا کر عباسی خاندان کے لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ دسترخوان کے نیچے سے آہ و نالہ کی آوازیں آ رہی تھیں' کھانا جب ختم ہوا تو ان کی جانیں بھی ختم ہو گئیں۔

یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ دمشق پایہ تخت ہی تک قصہ محدود نہ تھا بلکہ ملک کے طول و عرض میں جہاں کہیں بنی امیہ اور بنی مروان کے کسی فرد کا بھی پتہ چلتا تھا' حکم تھا کہ ختم کر دیے جائیں۔ یہی کیا گیا' حتیٰ کہ "بجز شیرخوار بچے کے ان میں کوئی باقی نہ رہا اور یہ کہ اندلس کی طرف جو بھاگ گئے۔" (کامل ابنِ اثیر' ص ۱۶۱)

بصرہ میں دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ

کمخواب کے پائجاموں اور زربفت' زروتار' زردوزی کے لباس میں بنی امیہ کے خاندان کے شہزادے مرے ہوئے گھوڑوں پر پڑے ہوئے ہیں اور کتے ان کی لاشوں کو چیرپھاڑ کر کھا رہے ہیں۔

اور زندے تو زندے' حد تو یہ ہے کہ حجاج بے چارا جس حکومت کا دامن قیامت کے دن سے باندھنے کے لیے ہرکردنی اور ناکردنی کا مرتکب ہوا تھا' اسی حکومت کے حکمرانوں کی مردہ لاشیں قبروں سے اکھاڑی گئیں۔ ان میں ہشام بن عبدالملک تھا' جس کی لاش واللہ اعلم سڑنے سے کسی وجہ سے محفوظ رہ گئی تھی۔ اس جرم کی سزا میں کہ اس نے امام زین العابدین کے صاحبزادے زید بن علی کو بلاوجہ سولی کی سزا دے کر ان کی ننگی لاش کو سال بھر تک بطور تشہیر کے لٹکا رکھا تھا اور آخر میں جلا کر' ہشام نے حکم دیا تھا کہ' ان کی خاک ہوا میں اڑا دی جائے ---- بجنسہٖ یہ ساری کارروائیاں ہشام کی اسی لاش کے ساتھ بھی کی گئیں' جو شاید اسی لیے محفوظ رہ گئی تھی۔

۲- ابراہیم تیمیؒ

یہاں سوچنے کی بات نہ حجاج کی موت ہے اور نہ لرزہ براندام کرنے والی اس کی بیماری۔ بجائے خود ان کی حیثیت بھی کچھ ہو، لیکن بُروں کے ساتھ اچھوں کو بھی مرنا ہی پڑتا ہے۔ امراض کے شکار سب ہی ہوتے ہیں، نیک ہوں یا بد۔ اور کیسے کیسے امراض، کیسی کیسی بیماریاں، کتابوں میں پڑھیے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جلیل القدر صحابی تھے، جن سے، بالاتفاق لوگوں نے لکھا ہے، ملائکہ مصافحہ کرتے اور سلام کیا کرتے تھے۔ نام ان کا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ تھا۔ بصرہ کے دینی علوم کے بڑے اہم سرچشموں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہاں کے قاضی بھی تھے۔ لیکن مہینہ دو مہینے نہیں، ابن جوزی نے لکھا ہے: "شکمی استسقاء کے مرض میں مبتلا تھے۔ اسی لیے تیس سال تک ایسے کھاٹ پر رہے جو بیچ سے کاٹ دیا گیا تھا"۔ (ص ۲۸۳)

الذہبی نے لکھا ہے کہ ان کو بواسیر کا مرض بھی تھا (تذکرۃ الحفاظ)۔ غالباً خونی بواسیر تھی، خون بہتا رہتا تھا۔ ان کے حال کا اندازہ اسی سے ہوتا ہے کہ ان کے خاص شاگرد مطرف نے ان سے کہا: "آپ جس حال میں رہتے ہیں، مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، اسی لیے عیادت و مزاج پرسی کی ہمت بہت کم ہوتی ہے۔" مگر باوجود ان تمام باتوں کے ان ہی مطرف (اپنے شاگرد سے) خود حضرت عمرانؓ فرماتے تھے: میاں، ایسا نہ کیا کرو، میرا یہ حال خود مجھے بھی محبوب ہے، اور میرے مالک کو بھی پسند ہے۔ (صفوۃ الصفوۃ، ج۱، ص ۲۸۳)

صحابہؓ کے دیکھنے والوں میں ایک بڑے نامی بزرگ ابوقلابہ نامی گزرے ہیں۔ علمِ حدیث کے اساطین میں شمار ہوتے ہیں۔ حکومت قاضی بننے پر اصرار کرتی رہی، لیکن اس عہدے کو قبول کرنے سے عمر بھر ہی گریز کرتے رہے۔ غیر معمولی فضائل و کمالات سے معمور تھے۔ آخر عمر میں بیمار پڑے۔ اس کا تو علم نہ ہو سکا کہ مرض کیا تھا، لیکن الذہبی کا بیان ہے "عرش (علاقہ مصر) میں آپ کی وفات ۱۰۴ھ میں ہوئی، آپ کے دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں غائب ہو چکے تھے اور بینائی بھی جاتی رہی تھی۔ مگر اس حال میں بھی خدا کے شکرگزار تھے۔" (ص ۸۹)

ابن سعد وغیرہ میں لکھا ہے کہ ابوقلابہ کی مزاج پرسی کو عمر بن عبدالعزیزؒ اور ابوالعالیہ جیسے اکابر آتے۔ ان کو اس حال میں دیکھتے تو کہتے: "ابوقلابہ، جیوٹ اور پامردی سے کام لو۔ اربابِ نفاق کو (اخلاص والوں) پر ہنسنے کا موقع نہ دینا"۔ (ج ۵، ص ۱۵۳)

اسی کی طرف الذہبی نے اشارہ کیا ہے کہ ہاتھوں، ٹانگوں، آنکھوں سب ہی کو کھو دینے کے

بعد بھی وہ اپنے مالک مولیٰ تعالیٰ جل مجدہ کا شکریہ ہی ادا کرتے رہے' اور اس کی حمد کا گیت ہی گاتے رہے' رحمہم اللہ۔

اور سچ تو یہ ہے کہ موت سے چارہ جب کسی کے لیے نہیں ہے' ہر سانس لینے والی زندہ جان موت کا مزہ بہرحال چکھ کر رہتی ہے' تو موت کے مقدمات امراض میں نیکوں اور بدوں میں امتیاز کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے۔ نتائج کے لحاظ سے اختلافات کے حدود تو مرنے کے بعد شروع ہوتے ہیں۔ اسی لیے حجاج کے حالات میں سب سے زیادہ توجہ کا مستحق یہ پہلو ہے کہ اپنے سیاسی ماحول کی سازگاریوں کو دیکھ کر آئندہ اور مستقبل کے متعلق دھوکہ میں مبتلا ہوگیا۔ ذہن اور زبان کے زور سے ہر غیر آئینی فعل پر آئین کا خول چڑھا دیتا تھا اور درحقیقت پس پردہ فوجی قوت پر اس کو بھروسہ تھا جس کی منطق کا جواب غریب نہتے عوام کے پاس نہیں ہوتا۔ تاریخ کا یہ سبق ہے کہ اس قسم کی بے باکیوں کا انتقام قدرت کی طرف سے عموماً غیر معمولی مہیب شکلوں میں لوگوں کے سامنے آیا ہے۔ اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر اس وقت تو وہ منہ زوریوں سے کام لیتے ہیں' ڈھیٹ بن کر جو جی میں آتا ہے کر گزرتے ہیں' لیکن بہت جلد اس کا خمیازہ بھی ان کو اسی طرح بھگتنا پڑا' جیسے مروانی حکومت کے حکمرانوں اور کارندوں کو بھگتنا پڑا۔ حجاج اس لحاظ سے اس کا مستحق ہے کہ قومیں اس کا مطالعہ کریں' اور سیاسی طاقت کے استعمال میں جن غیر معمولی محتاط و نازک ذمہ داریوں کی ضرورت ہے' اس کا سبق سیکھیں۔

کچھ بھی ہو حجاج اور حجاج کی ظالمانہ چیرہ دستیاں تو اتنی مشہور ہیں کہ تفصیلاً نہ سہی اجمالاً اس کے طرزِ عمل کی خصوصیتوں سے مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ عموماً واقف ہے۔ دنیا کی ایک حکومت کے ساتھ اس کی حد سے گزری ہوئی وفا شعاری کے مقابلہ میں ہم حضرت عمران بن حصین صحابیؓ اور ابوقلابہ تابعیؒ جیسے بزرگوں کے حالات سے بھی عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ آدمی چاہے تو خدا کا بھی ایسا وفادار بندہ بن سکتا ہے کہ تیس تیس سال کٹے ہوئے کھاٹ پر گزر گئے' دونوں ہاتھ' دونوں پاؤں' دونوں آنکھیں غائب' لیکن ہر حال میں شاکر ہیں' اسی کو اپنا محبوبِ حال یقین کرتے ہیں۔ اسی کے مقابلہ میں حجاج تھا کہ خدا کے چند بندوں یعنی مروانی حکومت کے حکمرانوں (عبدالملک اور ولید) کی وفاداری میں اپنا سب کچھ تج دیا۔ اپنی زندگی' اپنی موت' حد یہ ہے کہ آخرت تک کو ان ہی کے قدموں پر نچھاور کرتے ہوئے مطمئن تھا کہ یہی کرنے کا کام تھا۔

لیکن درحقیقت جن صاحب کی عجیب و غریب موت کا ذکر میرے پیشِ نظر ہے وہ حجاج ہی کے عہد کے ایک گمنام غیر مشہور آدمی کی موت ہے۔ ان کا نام ابراہیم تھا۔ اپنے قبیلہ کی طرف

منسوب ہو کر ابراہیم تیمیؒ کے نام سے لوگ ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ان کی موت میں وفاداری ہی کا دوسرا پہلو آپ کے سامنے آئے گا۔

صورت یہ پیش آئی کہ کوفہ جس کے دارالامارہ میں بیٹھ کر حجاج اپنی من مانی کارروائیوں میں مشغول تھا' یہیں ایک اور بزرگ ابراہیم نامی تھے۔ یہ ہماری علمی اور فقہی تاریخ میں ابراہیم نخعیؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ فقہ حنفی کا اساسی نقشہ دراصل ابراہیم نخعیؒ ہی کی اجتہادی کوششوں سے تیار ہوا۔ امام ابوحنیفہؒ نے' جو بیک واسطہ ان کے شاگرد ہیں' اپنے زمانہ میں باضابطہ ایک آزاد مجلسِ وضعِ قوانین قائم کر کے ابراہیم نخعیؒ کے قائم کیے ہوئے نقشہ کو مکمل کیا اور آب و رنگ اس میں بھرا۔ اس لیے حنفی مسلمانوں کی دینی زندگی جن فقہی مسائل کے زیرِاثر گزر رہی ہے ان کو ''حنفی فقہ'' کے نام سے لوگوں نے موسوم کر رکھا ہے۔ ورنہ صحیح معنوں میں اس کا نام چاہیے تھا' ''ابراہیمی حنیفی'' فقہ رکھا جاتا۔

امام شعبی کے یہ الفاظ جو ابراہیم نخعیؒ کی وفات کے بعد ان کی زبان سے نکلے تھے: ''خدا کی قسم! ابراہیم نے اپنا جیسا آدمی اپنے بعد کہیں نہیں چھوڑا' نہ کوفہ میں' نہ بصرہ میں' نہ شام میں' نہ یہاں' نہ وہاں' نہ حجاز میں''۔ (طبقات ابن سعد' ج۵' ص۱۹۸)

امام شعبی کی جلالتِ قدر سے واقفیت کے بغیر ان الفاظ کی قدروقیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بہرحال ابراہیم نخعیؒ کے تفصیلی حالات کا مطالعہ تو تفصیلی کتابوں میں کرنا چاہیے۔ اس وقت میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ حجاج کی وجہ سے رست وخیز کا جو عالم کوفہ میں برپا تھا۔ حالانکہ حضرت ابراہیم سیاسی معاملات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے' تعلیم وتدریس کے ساتھ زہدوریاضت کی زندگی گزارتے تھے' اب واللہ اعلم کیا صورت پیش آئی کہ حجاج کی نگاہوں پر وہ بے چارے بھی چڑھ گئے۔ شاید اس قسم کے فقرے جو کتابوں میں ابراہیم نخعیؒ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں مثلاً جبابرہ (یعنی ظلم سے حکومت کرنے والوں) پر بھی کبھی لعنت کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ یہ فقرہ بھی ان کی زبان پر جاری ہو گیا: ''اندھے ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ حجاج کے معاملہ میں کوئی اندھا بینی سے کام لے''۔ (طبقات' ج۵' ص۱۹۵)

حجاج کے جاسوسوں نے شاید ان ہی باتوں کو حجاج تک پہنچا دیا۔ بھلا وہ ان باتوں کو کہاں برداشت کر سکتا تھا۔ ابراہیم نخعیؒ کے نام سے وارنٹ جاری ہو گیا۔ کسی طرح وارنٹ کی تعمیل ہونے سے پہلے ان کو خبر ہو گئی۔ بے چارے اپنے بعض مخلصوں کے مکان میں روپوش ہو گئے۔ طبقات میں ہے کہ ''جمعہ اور عیدین کی نمازوں سے بھی روپوشی کے اس زمانہ میں ابراہیم کو محروم

ہونا پڑا۔" (ج ۵ ص ۱۵۳)

حکومت کے نمائندے ان کے سراغ میں لگے ہوئے تھے' اب یہیں سے سننے کی بات ہے۔ جس زمانہ میں یہ واقعہ میری نظر سے کتابوں میں گزرا' حیران ہو کر رہ گیا' سوچتا تھا کہ دین اور دینی علوم کی وفاداریوں میں لوگ کیا اس حد تک بھی جا سکتے ہیں؟

عرض کر چکا ہوں کہ اسی کوفہ میں ابراہیم نخعیؒ کے ایک ہم نام بزرگ ابراہیم تیمیؒ بھی رہتے تھے۔ غریب آدمی تھے۔ مہینوں گزر جاتے اور باضابطہ کھانا کھانے کا موقع نہ ملتا۔ جو کچھ بھی مل جاتا اسی سے سدِ رمق کا کام لیتے۔ آخر میں کوفہ کی مسجدوں میں گھوم گھوم کر وعظ کہا کرتے تھے۔ ان کی عبادت اور زہدو ریاضت کے قصے کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں۔ یہاں جس چیز کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حجاج کے کارندے جو ابراہیم نخعیؒ کی تلاش میں تھے' ایک دفعہ ابراہیم تیمیؒ کے پاس پہنچے اور بولے' ابراہیم کو تم جانتے ہو' امیر یعنی حجاج کا حکم ہے کہ ان کو گرفتار کر کے حاضر کیا جائے۔ ابراہیم تیمیؒ کا بیان ہے کہ میں یہ جانتا تھا کہ ابراہیم نخعیؒ کے متعلق مجھ سے یہ پوچھ رہے ہیں' لیکن نخعی کے لفظ کا اضافہ انھوں نے نہیں کیا تھا اس لیے جواب میں میں نے کہا کہ انا ابراهیم (ابراہیم کو پوچھتے ہو تو وہ میں ہوں' یعنی میرا نام ابراہیم ہے۔)

پکڑنے والوں نے آپ کو پکڑ لیا اور گرفتار کر کے خونی حجاج کے دربار کی طرف لے چلے۔ حجاج کے سامنے پیش کر دیے گئے۔ جان رہے ہیں کہ صرف اتنی بات کہ "میں ابراہیم نخعی نہیں ہوں" ان کی برات کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ لیکن خاموش حجاج کے سامنے کھڑے رہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ واسط کے جیل خانہ دیماس نامی میں ان کو قید کر دیا جائے۔ واسط روانہ کر دیے گئے۔ بیان کیا گیا ہے' طبقات میں بھی ہے' کہ واسط کا یہ جیل خانہ اس طریقہ سے بنایا گیا تھا کہ نہ اس پر چھت ڈالی گئی تھی اور نہ ایسے حجرے اور مکانات بنائے گئے تھے جن میں قیدیوں کو کم از کم دھوپ' بارش' سردی سے پناہ ملتی بلکہ صرف چار دیواری تھی۔ اسی کے میدان میں لوگوں کو ڈال دیا جاتا تھا۔ خصوصیت اس قید خانے کی یہ بھی تھی کہ ایک قیدی کے ساتھ دوسرے قیدی کو زنجیروں سے جکڑ دیا جاتا تھا۔

بے چارے ابراہیم تیمیؒ کے ساتھ یہ سب کچھ کیا گیا۔ کسی اجنبی قیدی کے ساتھ ان کو بھی باندھ دیا گیا' اور اسی حال میں وہ جیل کے اندر ڈال دیے گئے۔ ماں کو ان کی خبر ہوئی' بچے کی محبت میں بے چاری کوفہ سے کسی نہ کسی طرح جیل تک پہنچی۔ جیل والوں کی اجازت سے بیٹے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کی اجازت مل گئی' لیکن اس عرصہ میں ابراہیم تیمیؒ کی صورت اتنی بدل

چکی تھی کہ ماں بھی اپنے بیٹے کو پہچان نہ سکی۔ ماں کو دیکھ کر خود ہی ابراہیم نے ان کو مخاطب کیا' تب آواز سے انھوں نے اپنے بچے کو پہچانا۔ ناقابلِ برداشت' حد سے گزری ہوئی ان تکلیفوں کے بعد بھی ماں تک پر یہ راز انھوں نے ظاہر نہیں کیا کہ نام سے دھوکا کھا کر ابراہیم نخعیؒ کی جگہ اس جیل میں مجھے لوگوں نے ٹھونس دیا ہے۔ بس ماں اپنے بچے کو دیکھ رہی تھی' اور بچہ اپنی ماں کو۔ ابراہیم تیمیؒ کو چھوڑ کر ان کی والدہ ماجدہ روتی ہوئی واپس ہو گئیں۔

ان کی واپسی کے بعد کہتے ہیں کہ اپنے سینے میں اسی راز کو دبائے ہوئے ابراہیم تیمیؒ کا جیل خانے ہی میں انتقال ہو گیا۔ حجاج واسط ہی میں تھا۔ خواب میں دیکھا کہ کہنے والا کہہ رہا ہے: "آج واسط میں ایک بہشتی آدمی مر گیا"۔ صبح کو معلوم ہوا کہ جیل میں ابراہیم نامی قیدی انتقال کر گیا۔ ہٹ دھرم حجاج جھنجھلا کر بولا: "شیطانی خواب تھا جو رات میں نے دیکھا"۔

لکھا ہے کہ ابراہیم تیمیؒ بے چارے کو ابراہیم نخعیؒ باور کرتے ہوئے شترکینہ حجاج نے حکم دیا کہ واسط کے گھورے پر ابراہیم کی لاش پھینک دی جائے' رحمۃ اللہ علیہ۔ حجاج کی اس مذبوحی حرکت پر ابراہیم کی بہشتی روح ہنستی ہو گی۔ جو ابراہیم نہیں تھا ابراہیم کا خاکی لباس تھا' حجاج اسی کو گھورے پر ڈال کر خوش ہو رہا تھا۔ المسعودی نے مروج میں نقل کیا ہے کہ جس وقت ابراہیم تیمی واسط کے جیل خانے میں داخل ہوئے تو سامنے ایک ٹیلہ تھا۔ اس پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے پکار رہے تھے: "جو آج اللہ کی آزمائش میں ہیں ان لوگوں کو خدا ہی کی طرف سے عاقبت و راحت کی خوشخبری ہو' اور آج اپنے آپ کو جو عافیت میں پا رہے ہیں خدا کی آزمائش کا ان کو انتظار کرنا چاہیے۔ لوگو' ذرا صبر سے کام لو' ذرا ٹھہر جاؤ۔" (ابن کامل' ۶' ص ۱۰۵)

حجاج بھی چلا گیا' ابراہیم بھی چلے گئے۔ حجاج نے دنیا کی حکومت کے حکمرانوں کے ساتھ وفاداری کا ایک ریکارڈ قائم کیا۔ لیکن دیکھا گیا کہ حجاج اور جس حکومت کے لیے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا' ایک چلہ بھی سالوں کے حساب سے پورا نہ کر سکی' اور جو کچھ انجام اس کا ہوا اسے بھی دنیا دیکھ چکی۔ مگر ابراہیم تیمیؒ نے اپنے آپ کو گم کر کے ابراہیم نخعیؒ کو اور ان کے فقہی کارنامہ کو بچا لیا۔ شاید کہا جا سکتا ہے کہ کرۂ زمین کے کروڑہا کروڑ حنفی مسلمانوں کی دینی زندگی کے نظام کی بقاء میں دوسرے اسباب کے ساتھ ابراہیم تیمیؒ کی یہ حیرت انگیز تاریخی وفاداری بھی شریک ہے۔ لِمِثْلِ ھٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ۔

شاید دنیا کی قوموں میں ابراہیم تیمیؒ کی استقامت و تحمل و رازداری کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہو --- وَفِیْ ذَالِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۔

۷۷

پاکستان کی خارجہ پالیسی

پروفیسر خورشید احمد

خارجہ پالیسی روایتی طور پر مملکت کی سلامتی کے امور سے بحث کرتی ہے۔ سلامتی قومی سطح پر، علاقائی سطح پر اور عالمی سطح پر۔ نیز سلامتی بھی صرف سیاسی یا دفاعی معنی میں نہیں، بلکہ اپنی تمام وسعتوں میں، جس میں سیاسی اور دفاعی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ معاشی، تہذیبی اور نظریاتی پہلو بھی شامل ہیں۔

ریاستوں کے مابین تعلقات طاقت کے توازن کے حوالے سے گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں، اور ہر قوم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس تناظر میں اپنا صحیح مقام حاصل کرے۔ کچھ عرصہ سے خارجہ پالیسی کا جھکاؤ صرف سیاسی حوالے سے ہی نہیں بلکہ معاشرت، معیشت، تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے تعاون حاصل کرنے کی طرف بھی ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی قوم کی خارجہ پالیسی میں ہمیشہ نظریاتی جہت بھی پائی جاتی ہے، خواہ یہ محدود سطح پر ہو یا وسیع مذہبی، تہذیبی اور اخلاقی سطح پر۔ حالیہ دور میں خارجہ تعلقات کی معاشی جہت بے حد نمایاں ہو گئی ہے، اگرچہ تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں گزرا ہے جب معاشیات نے بین الاقوامی تعلقات میں کچھ نہ کچھ کردار نہ ادا کیا ہو۔ مثال کے طور پر ہم استعماریت کے دور کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک کہ ہم گزشتہ پانچ صدیوں کے دوران ریاستوں کے باہمی تعلقات کے قیام میں معیشت کے کردار کو نہ سمجھ لیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد کے مرحلہ میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان باہم مقابلہ کے حوالے سے معاشی ترقی، نئی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

۱۹۷۰ کے عشرے کے وسط سے انسانی حقوق کے لیے فکر مندی کے ایک نئے عنصر نے بھی

پروفیسر خورشید احمد کی سینیٹ میں تقاریر کے چار مجموعے عنقریب شائع ہونے والے ہیں۔ خارجہ پالیسی کے حوالے سے مجموعہ کا ابتدائیہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

خارجہ پالیسی میں اپنی جگہ بنا لی ہے۔ اس کے بڑے دور رس اثرات ہیں اور اس کی وجہ سے "قومی حاکمیت" (National Sovereignty) کا روایتی تصور بھی تبدیل ہو رہا ہے اور ایک ملک کے معاملات میں دوسرے کی مداخلت کی حدود بھی تغیرپذیر ہیں۔ اس سلسلہ میں نیور مبرگ ٹرائل کے موقع پر "انسانیت کے خلاف جرائم" کے باب میں جو موقف اختیار کیا گیا اس نے قانونی اقدام کے تصور پر بڑے دور رس اثرات مرتب کیے۔ اور پھر ہلسنکی معاہدات نے ثقافت' ابلاغ اور انسانی حقوق کو بھی بین الاقوامی تعلقات کے قیام میں اہم مقام دے دیا ہے۔ اس لیے حالیہ تبدیلیوں کو سمجھنے کے لیے خارجہ پالیسی اور ریاستوں کے مابین تعلقات کے اس وسعت پذیر تصور کے تدریجی لیکن یقینی اثرات کا مکمل ادراک ضروری ہے۔ اب ثقافتی روابط اور نظریاتی پہلو خارجہ پالیسی کا لازمی حصہ بن چکے ہیں۔

ذرائع ابلاغ میں انقلابی تبدیلیاں اور خصوصاً ان کا وہ کردار جو وہ آج بین الاقوامی تعلقات کی تعیرو تشکیل میں ادا کر رہے ہیں' سنجیدگی سے قابل غور ہے۔ اس سلسلہ میں ذرائع ابلاغ نے جو کردار فاک لینڈ اور خلیج کی جنگ اور اس کے علاوہ بھی ریاستوں کے مابین تعلقات میں ادا کیا ہے' سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر ایران کا یرغمالی بحران (hostage crisis) اور ایران کے بارے میں دنیا کے رویہ کو متاثر کرنے میں اس کا کردار' اب خارجہ پالیسی پر گفتگو کا نہایت اہم حصہ ہیں۔ اسی طرح ٹیکنالوجی کی اہمیت بھی مسلم ہے اور پالیسی ساز اس میدان کی تازہ ترین ترقیات سے اپنے کو غیر متعلق نہیں رکھ سکتا۔ خلیج کی جنگ میں خارجہ پالیسی کے ایک عامل کے طور پر اس کا استعمال ایک نئی بات ہے۔ یہ تمام پہلو بڑے اہم ہیں اور ہم سب کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ ۹۰ کے عشرے کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ہمہ جہت اور جامع نقطہ نظر اپنانا ہو گا۔

دوسری طرف وہ منظر نامہ بھی برابر کی اہمیت رکھتا ہے جس کا حوالے سے خارجہ پالیسی کے جائزہ لیا جائے۔ درحقیقت خارجہ پالیسی کا جائزہ ایک مسلسل اور باقاعدہ عمل ہونا چاہیے۔ آج ہم تاریخ کے ایک انتہائی اہم دور سے گزر رہے ہیں جس میں خارجہ پالیسی کے ازسرنو جائزہ کی ضرورت ہے۔

خارجہ پالیسی کو صرف دفتر خارجہ کے حوالے کر دینا خوشگوار بات نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دفتر خارجہ میں کام کرنے والے افراد کے پاس اعلیٰ خصوصی مہارت اور وسیع تجربات ہوتے ہیں جن کی بناء پر وہ قوم کی خارجہ پالیسی تشکیل دینے اور اس پر عمل کرنے میں اہم

کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن ملک میں ایسے تحقیقی ادارے' جامعات اور اہل فکر و نظر بھی ہیں جو طویل المدت حکمت عملی کے سوچنے میں اور بنیادی راہنما خطوط متعین کرنے میں ممد معاون ہو سکتے ہیں۔ خود دفتر خارجہ میں جس چیز پر سب سے کم توجہ دی جاتی ہے وہ بدلے ہوئے حالات کے مطابق خارجہ پالیسی پر غور و فکر اور اس کا عمیق تجزیہ ہے۔ اسی طرح سیاست دانوں اور پارلیمنٹ کا کردار بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ دنیا کے اکثر ممالک میں' بشمول ہمارے' سیاست قوم کی بقا اور ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ ایک مقدس فریضہ ہے' جیسا کہ انگریز مصنف سیمول جانسن نے کہا ہے "قانون سازوں کو اور ذرائع ابلاغ کو خارجہ پالیسی کی تشکیل میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہیے"۔ بد قسمتی سے وہ کوئی حصہ ادا نہیں کرتے۔ یہ خارجہ پالیسی کی کمزوری کی ایک وجہ ہے۔

ان حالات میں پچھلے پینتالیس سال میں جو کچھ ہم حاصل کرنے کے قابل ہوئے ہیں اس کا جائزہ اور آنے والے نازک حالات کے حوالے سے نئی فکر کی تشکیل لازم ہے۔ خارجہ پالیسی نے ہمارے قومی مفادات کی بہتری میں جو کردار ادا کیا ہے ہمیں اسے کم نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہم ناکام نہیں رہے ہیں۔ کئی کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں۔ ہمیں اپنی پالیسیوں کا معروضی جائزہ لینا چاہیے اور بدلے ہوئے حالات کا ادراک کر کے اپنا ردعمل طے کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں جانبدارانہ رویہ اور یک رنگی سے احتراز کرنا چاہیے۔

آج کے تناظر میں میرے نزدیک "پاکستان کی خارجہ پالیسی" کے حوالے سے درج ذیل گیارہ نکات قابلِ غور ہیں۔

سرد جنگ کا خاتمہ

۱- دوسری جنگ کے بعد بین الاقوامی تعلقات کی جو عمارت دو سپر پاورز کے درمیان رقابت پر تعمیر ہوئی تھی' وہ اب گر گئی ہے۔ ۱۹۴۹ سے ۱۹۸۹ کا تقریباً ۴۰ سال کا عرصہ سرد جنگ کا دور تھا جس میں سپر پاورز نے روایتی ہتھیاروں سے اور پھر نیوکلیائی قوت سے ایک دوسرے کی طاقت اور دائرہ کو محدود کرنے کے لیے کوشش کی۔ اس کوشش نے جہاں کئی میدانوں میں شدید کشکش اور اہم تنازعات پیدا کیے وہیں اس نے عالمی سطح پر امن قائم رکھنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس عرصہ کے دوران دونوں نظاموں یعنی اشتراکیت اور مغربی سرمایہ داری کے درمیان نظریاتی کشکش بھی رہی ہے۔ روسی اشتراکیت کے شیرازہ کے منتشر ہونے کے ساتھ ہی وہ پرانا نظام جس پر قوت کی مساوات (balance of power) قائم تھی ختم ہو گیا اور اس کے ٹوٹنے

کے بعد دنیا کے سیاسی منظر پر ایک بنیادی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ آج پاکستان کو اس کی روشنی میں اپنی پالیسی کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

یک قطبی دنیا

۲ - نیو ورلڈ آرڈر کے سائے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ایک نقشہ یہ ہو سکتا ہے کہ یک قطبی دنیا میں ایک سپرپاور ہی غالب ہو۔ بین الاقوامی ایجنسیاں (بشمول اقوام متحدہ) اس کے خادم ہوں اور بین الاقوامی قانون محض اس کی مرضی کی آواز بازگشت بن کر رہ جائے۔ بظاہر دنیا ایک ایسے ہی دور کی طرف بڑھتی نظر آرہی ہے۔ چنانچہ ایک سپرپاور کی بالادستی کے امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کوئی پالیسی بنانے میں اس پہلو کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

اسلامی بنیاد پرستی

۳ - مسلم دنیا پر آج اسلامی بنیاد پرستی کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر الزام کا لفظ استعمال کیا ہے کیوں کہ قدیم دشمن کمیونزم کے خاتمے سے پیدا کردہ خلا کو ایک نئے دشمن سے جس کا نام "اسلامی بنیاد پرستی" رکھا گیا ہے' پر کیا جا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف یورپ بلکہ تمام مغربی دنیا کے اعصاب پر یہ خطرہ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح سوار ہوگیا ہے۔ مغرب خود ہی اس کو دیکھ دیکھ کر پریشان ہے اور سب کو اس کو ہوا دکھا رہا ہے۔ اس پر کیا تبصرہ کیا جائے۔ لیکن اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ کتابوں' مطالعوں اور سیمیناروں کا ایک سلسلہ یورپ اور امریکہ سے جاری ہے۔ امریکہ میں اسلامی بنیاد پرستی کو مستقبل کا خطرہ قرار دیا گیا ہے۔ نیٹو کے سیکرٹری جنرل کے یہ الفاظ ریکارڈ پر ہیں کہ یورپ کا نقشہ بدل گیا ہے' بلاشبہ وہ خطرہ جسے سرخ رنگ سے نقشہ پر دکھایا جاتا تھا' غائب ہوگیا ہے لیکن نیٹو کی ضرورت کسی طرح بھی کم نہیں ہوئی کیونکہ سرخ کی جگہ سبز رنگ کی شکل میں نیا خطرہ رونما ہوتا نظر آرہا ہے۔ رونالڈ ریگن کی خود نوشت (Ronald Reagon : An American Life) اس مفروضہ دیو کے تذکرہ سے بھری پڑی ہے اور سابق صدر رچرڈ نکسن کی حالیہ تصنیف (Seize the Moment) میں اسلامی بنیاد پرستی اور اس کے مقابلہ کی حکمت عملی کے لیے ایک مکمل باب وقف کیا گیا ہے۔ نکسن نے پاکستان کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا ہے اور اسے ہوا بنا کر نہیں دکھایا لیکن ایران اور بنیاد پرستی کے دینی احیا کو خطرہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ میرے خیال میں ہم اپنی خارجہ پالیسی بناتے ہوئے اس صورت حال کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔

طاقت کے نئے مراکز

۴ - سوویت یونین کے زوال کے باوجود روسی فیڈریشن ایک اہم ملک ہے اور اپنی داخلی کمزوریوں کے باوجود رہے گا۔ اس کے علاوہ تین ممالک یعنی جاپان' چین اور جرمنی میں عالمی طاقت بننے کی صلاحیت ہے اور وہ یک قطبی دنیا کے لیے چیلنج بن سکتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے لیے بلکہ پوری دنیا کے لیے' خصوصاً مسلم ممالک کے لیے' غیر معمولی اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔ جاپان کو معاشی اقدامات سے غیر مستحکم کیا جا رہا ہے۔ جاپان کی مضبوط معیشت کو ایک چیلنج سمجھا جا رہا ہے' اور یہ سب کچھ اس لیے کہ اس میں یہ سیاسی اور دفاعی صلاحیت ہے کہ وہ امریکہ کی ہٹ دھرمی کے سامنے ڈٹ جائے۔ جرمنی کا اتحاد اور یورپ کو متحد کرنے میں اس کا کردار' فرانس کے ساتھ دوستی' یوگوسلاویہ کے بحران کے حل میں اس کا قائدانہ کردار اور کردش کے لیے اس کے اقدام نے امریکا کے لیے تشویش پیدا کر دی ہے۔ چین دوسرا ملک ہے جو ان مایوس کن حالات میں امید کا پیغام ہے۔ اسی لیے چین کو تنہا کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ مذکورہ تینوں چیلنج کا مقابلہ امریکا کی مجموعی حکمت عملی کا ایک حصہ ہے۔ جاپان' چین اور جرمنی ان اقوام کے فطری حلیف ہو سکتے ہیں جو یک قطبی دنیا کے تصور سے خوش نہیں ہیں۔ نئے حقائق کا ایک رخ یہ بھی ہے۔ پاکستان کے لیے اس سلسلہ میں چین کی دوستی سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اسی طرح پاکستان کو جاپان سے بھی روابط بڑھانے چاہئیں۔ چین' جاپان اور مسلم دنیا کے درمیان معاشی اور سیاسی تعاون دنیا کے توازنِ طاقت کو متاثر کر سکتا ہے۔

علاقائی اور نسلی قومیتیں

۵ - بین الاقوامی تعلقات میں ایک متضاد صورت حال پائی جاتی ہے۔ ایک طرف قومی ریاست سکڑ رہی ہے اور اس کی جگہ لینے کے لیے بالائے ریاست ادارے ابھر رہے ہیں۔ قومی ریاست اور اس کی محدود حاکمیت کے تصورات ماند پڑ رہے ہیں اور بین المملکتی اتحاد اور الحاق روز افزوں ہیں۔ دوسری طرف نسلی اور علاقائی قومیتیں سر اٹھا رہی ہیں اور یورپ اور ایشیا میں اہم سیاسی قوتیں بن رہی ہیں۔ ایک طرح سے تو آبادیاتی دور کا منظر دوبارہ سامنے آرہا ہے۔ جب فرانس افریقہ میں آیا تو یہ ایک ملک تھا اور جب وہاں سے گیا تو ۱۷ قومی ریاستیں بنا کر گیا۔ اب یورپ میں وسط ایشیا جیسی صورت حال ہے' جہاں نسلی اور علاقائی قومیتیں سر اٹھا رہی ہیں اور' قومیت اور سیکولرزم کا کتنا ہی ملمع کیوں نہ چڑھایا جائے' اس اکھاڑ پچھاڑ کے اندر مذہبی جہتیں

ہیں۔ سربوں کے ساتھ روس کی پالیسی کا تعین آرتھوڈکس عیسائی کر رہے ہیں' جنھوں نے چار صدیوں سے تاریخ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات غیر اہم نہیں کہ قبطی سیکرٹری جنرل نے بوسنیائی مسلمانوں کے قتل عام کو رکوانے کے یورپی اقدامات کی مخالفت کی۔ کیا وہ ایسا کرنا سرب عیسائیوں کے مفادات کے خلاف سمجھتا ہے ؟ اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ترقی کے ایک دور کا خاتمہ

۶ ۔ معاشی ترقی کے جو ماڈل اور اس کے حصول کے لیے جو حکمت عملی دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنائی گئی' ان کی ناکامی ایک حقیقت ہے۔ لیکن اس کا صحیح ادراک نہ ترقی یافتہ ممالک میں ہے اور نہ ترقی پذیر ممالک میں۔ ایک نئی اور زیادہ حقیقت پسندانہ حکمت عملی وقت کی ضرورت ہے۔ بریٹن ووڈز پر کیے گئے انتظامات اب غیر موثر ہو گئے ہیں۔ تیسری دنیا کے ممالک کا قرضے کا بحران آئے دن گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ میرے نزدیک ریو کی حالیہ سربراہی کانفرنس میں ترقی کے اس طریقہ کار کا کتبہ لکھ دیا گیا جو پچھلے ۴۰ برسوں میں اپنایا گیا تھا۔

اسلحہ پر پابندی

۷ ۔ ہتھیاروں کے پھیلاؤ پر مغرب کی نئی تشویش سے بھی نئے مسائل پیدا ہوں گے۔ ابھی تک وہ ہتھیاروں کو بنانے والے اور فروخت کرنے والے ہیں۔ لیکن پچھلے چند سالوں میں ان پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ یہ ہتھیار ان کے لیے ایسے حالات پیدا کر سکتے ہیں جن کو وہ کنٹرول نہ کر سکیں گے اور جو ان کے اسٹریٹجک مفادات کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس نے ایک بالکل نئی صورت پیدا کر دی ہے جس کا مقابلہ کرنا تیسری دنیا اور خصوصیت سے مسلم ممالک کے لیے ضروری ہے۔

مسلم ممالک سے امتیازی سلوک

۸ ۔ علاقے کے لیے خلیج کی جنگ کے نتائج اور مضمرات کا تجزیہ کرنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی بھی مسلمان مملکت کو اتنا مضبوط ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ آزاد پالیسیاں اختیار کر سکے۔ ایران اور پاکستان کو محتاط ہونا چاہیے اور اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے حکمت عملی تیار کرنا چاہیے۔

افغان جہاد کے بعد

۹ ۔ افغانستان میں مجاہدین کی حکومت کا ممکنہ قیام اور وسط ایشیا سے رابطہ ایسی حقیقی تبدیلی

کا آئینہ دار ہے جو پورے علاقے کے لیے، پاکستان کے لیے، تمام مسلم دنیا کے لیے اور سیکولرزم کے مستقبل کے لیے طویل المیعاد نتائج کی حامل ہے۔ مغربی ممالک جو ایک وقت افغانستان میں روس کی شکست میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے تھے اب ان کی دلچسپیاں یکسر بدل گئی ہیں۔ اب وہ افغانستان کے استحکام میں نئے خطرات کی بو سونگھ رہے ہیں اور افغانستان کی خانہ جنگی سے اپنے مفادات کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان حالات میں پاکستان کی افغانستان پالیسی اور پاکستان اور افغانستان میں تعاون کے ایک نئے دور کو حقیقی بنانے کی سعی ہماری خارجہ پالیسی کے اہم چیلنج ہیں۔

بھارت کا خطرہ

۱۰۔ پاکستانی تناظر میں بھارت کا جنوبی ایشیا میں ایک بڑی طاقت بننے کا منصوبہ ہمارے لیے بڑی تشویش کی بات ہے۔ بھارت اور امریکہ کے تعلقات کوئی نئی بات نہیں ہے۔ درحقیقت ۸۳ - ۱۹۸۲ میں جب ہم نے افغانستان میں مجاہدین کے حق میں موقف اختیار کیا اس وقت سے امریکا نے بھارت میں نسبتاً زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ بدقسمتی سے ہمارے پالیسی ساز اس کا نوٹس لینے میں ناکام رہے۔ اسی طرح بھارت کی چین کے ساتھ حالیہ مصالحت پر پوری طرح نظر رکھنی چاہیے اور تجزیہ کرنا چاہیے۔ نیز ان حقائق کی روشنی میں اپنے مقام کی حفاظت اور اپنے مفاولات کے تحفظ کے لیے بندوبست کی فکر ہمارے لیے ضروری ہے۔ میں اب بھی اس رائے کا حامی ہوں کہ پاکستان اور چین کے مفادات ہم آہنگ ہیں اور آئندہ بھی دونوں کا ایک دوسرے کے لیے اہم سہارا رہنا ضروری ہے۔

امریکہ پر انحصار

۱۱۔ آخری اور نازک مسئلہ پاکستان کا امریکا پر انحصار ہے جس کا آغاز اکتوبر ۱۹۴۷ ہی سے ہو گیا تھا اور جو ۱۹۵۴ سے لے کر اب تک ہماری خارجہ پالیسی اور دفاعی پالیسی کا سب سے اہم پہلو رہا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج تک یہ انحصار یک طرفہ رہا ہے جس نے ہمیں اپنے فیصلے کرنے میں عدم توازن سے دوچار کیا ہے اور ہمیں امریکی سازشوں کا شکار بھی بنایا ہے، اور ایک آزاد مسلم ملک کی حیثیت سے ہمارے کردار کو مجروح کیا ہے۔

ان سب مسائل اور چیلنجوں کے باوجود پاکستان کا ایک عظیم مستقبل ہے۔ ہم میں کمزوریاں ضرور ہیں مگر کمزوریوں سے پاک کون ہے؟ اسلام کے ساتھ ہمارے تاریخی عہد کو پس پشت

۲۲۲

نہیں ڈالا جا سکتا۔ اس ملک کو قائم کرنے والے اس کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست دیکھنا چاہتے تھے اور یہاں کے عوام بھی یہی چاہتے ہیں۔ اگر چند سیاستدانوں نے پاکستان کی تقدیر کے ساتھ بے وفائی کی ہے یا کچھ سیکولر رہنما لوگوں کی خواہشات پر پورا نہیں اتر سکے تو یہ ایک دوسری بات ہے۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی کے چند نظریاتی پہلو جو کسی حد تک نظرانداز کر دیے گئے ہیں' نئے عزم اور جذبے اور مناسب حکمت عملی کے ساتھ بحال کیے جانے چاہئیں۔ اس سلسلے میں میری گزارشات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ نظریاتی خارجہ پالیسی

ایک نظریاتی ریاست کی خارجہ پالیسی کا واضح تصور ہونا چاہیے' اس لیے کہ اس ریاست کا صرف سیاسی اور معاشی یا جغرافیائی وجود نہیں ہے بلکہ وہ اس سے بڑھ کر ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک نظریاتی ریاست اپنے اسٹرٹیجک مفادات' اور سلامتی اور معیشت کی فکر نہ کرے۔ اس کے برعکس ہماری خارجہ پالیسی کو ہماری قوم کے مفادات' ضروریات اور اقدار کا بہترین امتزاج ہونا چاہیے۔ اور ساتھ ہی لچک دار ہونا چاہیے' اس لیے کہ ایسے حالات ہو سکتے ہیں کہ ایک کو دوسرے کی خاطر کم اہمیت دی جائے لیکن ان میں سے کسی کو بھی بالکل نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان تمام عوامل کے درمیان حقیقی توازن ہونا چاہیے۔ یہ واضح رہے کہ اسلام ہمیں ان معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا جو بین الاقوامی سفارت کاری کی حدود سے باہر ہوں۔ ہماری سفارت کاری کو کتابی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس میں نظریاتی اور انقلابی امنگ ہونی چاہیے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ لفاظی اور عمل الگ الگ دائرے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم لفاظی میں بہت آگے اور عمل میں بہت پیچھے ہوتے ہیں۔ جب کہ ہونا اس کے الٹ چاہیے۔

۲۔ امتِ مسلمہ

ایک اسلامی ریاست کی حیثیت سے پاکستان کی خارجہ پالیسی کی اوّلین ترجیح اس ملک کی سلامتی اور ترقی ہونی چاہیے۔ پاکستان امت مسلمہ کا ایک حصہ ہے۔ ہمارے لیے امت مسلمہ کا اتحاد اور ترقی کا مسئلہ بھی سرفہرست ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے' ہمیں اس کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔ اگر مغرب انسانی حقوق کے نام پر

تشویش میں مبتلا ہو سکتا ہے اور یہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے داخلی معاملات میں مداخلت تصور نہیں کی جاتی تو بحیثیت مسلمان ہمارے لیے اظہار تشویش کے لیے دوسرا معیار کیوں ہو؟ پاکستان کی ترقی و استحکام اور امتِ مسلمہ کی وحدت اور اس میں باہمی تعاون کا فروغ ہماری خارجہ سیاست کے واضح اہداف ہونا چاہئیں۔

۳- عادلانہ عالمی نظام

ہماری خارجہ پالیسی کا ایک اور ہدف ایک عادلانہ عالمی نظام کا قیام ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں نظریہ کے کردار کی کلید یہی ہے اور "اسلامی بنیاد پرستی" کے مفروضہ خطرے کا جواب بھی یہی ہے۔ اپنی اقدار پر قائم رہتے ہوئے ہمیں اہل مغرب کو یہ بتانا چاہیے کہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے مذہب، تہذیب اور ثقافت میں کثرت کو تسلیم کیا ہے۔ ہم صرف یہی نہیں چاہتے کہ دوسرے اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کریں بلکہ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمیں اپنے اصولوں اور اقدار کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ملے۔ کثرت (Pluralism) کو تسلیم کرنے کے اس اصول پر ایک عادلانہ عالمی نظام قائم کیا جا سکتا ہے نہ کہ واحد نظریے، واحد سیاسی نظام اور واحد معاشی نظام کے تصور کو دوسروں پر تھوپ کر۔ سرد جنگ کے دور کا ایک خوشگوار پہلو یہ ضرور تھا کہ بڑی طاقتوں کی رقابت میں دنیا کے محروم اور پسماندہ ممالک کو بھی اپنا مقام بنانے کی گنجائش ملی۔ پرانے نظام کے خاتمہ سے ہم سترھویں اور اٹھارھویں صدی کی سیاست کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اور یہ وقت ہے پاکستان جیسی نظریاتی ریاست کے ایک عادلانہ عالمی نظام کے علمبردار کی حیثیت سے سامنے آنے کا۔ اس کا مطلب نہ تنہائیت پسندی ہے، نہ Autarky یا علاحدگی، بلکہ اس کا مطلب ہے سب کے ساتھ دوستی۔ چین کے ساتھ ہماری دوستی، جس کی بنیاد عدم مداخلت اور ایک دوسرے کی سالمیت کے احترام پر ہے، اسلام کی دوسروں کے ساتھ چلنے کی ایک اچھی مثال ہے۔ ہمیں اپنی ریاست اور خارجہ پالیسی کے امور میں نہ صرف اپنی خاطر، بلکہ غیر مسلموں کی خاطر بھی اخلاقی پہلو کو اہمیت دینا چاہیے۔ دوسروں کی محتاجی ختم کرنے اور خود انحصاری کی حکمت عملی اختیار کرنے کا مطلب تنہائیت (Isolatioism) نہیں ہے۔ ہمارا ہدف خود مختاری ہے جو ایک جامع اصطلاح ہے۔ اس کے مطلب یہ ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ رہنے کے لیے تو تیار ہیں لیکن ان کے محتاج ہو کر نہیں کہ دوسرے ہم پر حکم چلائیں۔ یہ ہمارے مسلمان ہونے کے شرف کے خلاف ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے یہ خود انحصاری پاکستان کی بنیاد پر اور پھر مجموعی طور پر پوری امتِ

مسلمہ کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ مسلم دنیا میں کئی اسٹریٹجک مراکز بنا کر ہم اس سمت میں آگے بڑھ سکتے ہیں۔ پاکستان ' افغانستان اور ایران کا تعاون اور پالیسی کے میدان میں ہم آہنگی نقطہ آغاز ہو سکتا ہے۔ اسی طرح خلیج' جنوب مشرقی ایشیا' وسطی ایشیا' اور مغربی افریقہ دوسرے مراکز ہو سکتے ہیں۔ ایک خاص مدت میں پوری مسلم امہ کی حقیقی خود انحصاری کے حصول کے لیے یہ چھ مراکز پہلا قدم ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اعلانات اور دعوے کم کرنے چاہئیں اور انسانی اور معاشی وسائل کے باہم رابطہ اور مواصلات کے بنیادی ڈھانچہ کی منصوبہ بندی اور تعمیر کے لیے سنجیدہ کوشش ہونا چاہیے۔ امت کی اجتماعی خود انحصاری کی عمارت انھی بنیادوں پر تعمیر ہو گی۔

اس کی بھی ضرورت ہے کہ مسلم ممالک کی باہمی آویزشوں کا تصفیہ کرنے کے لیے کوئی طریقہ کار طے ہو۔ بدقسمتی سے او۔ آئی۔ سی بھی اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکی ہے اور اس میں پاکستان کا کردار بھی مایوس کن ہے۔ چنانچہ آپس کی کشمکش اور تناؤ کو ختم کرنے کے لیے کسی میکانزم کی ضرورت ابھی باقی ہے۔

اسلامی خارجہ پالیسی کو غیر فرقہ وارانہ ہونا چاہیے۔ شیعہ سنی تنازعہ بڑا سنگین مسئلہ ہے۔ یہ پاکستان' ایران اور افغانستان کے تعلقات کو ناخوشگوار بنا سکتا ہے۔ اس سے نظریں بند کرنا ہمیں حقیقت سے دور کر دے گا۔ ہمیں اپنی خارجہ پالیسی میں اسے آڑے نہیں آنے دینا چاہیے بلکہ ہمیں اسلامی حدود میں ایسے طریقہ کار وضع کرنا چاہئیں جن سے پاکستان اور افغانستان میں شیعہ اقلیت اور ایران میں سنی اقلیت کے حقوق کو تحفظ اور ضمانت ملے اور یہ ملک اسلامی ہم مقصدیت کے ساتھ ساتھ مذہب اور مسلک کے باب میں باہم رواداری کی ایک روشن مثال قائم کر سکیں۔

مندرجہ بالا گزارشات پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل نو کے لیے رہنما اصول کا کام دے سکتی ہیں۔

مغرب کے خلاف

مسلمانوں کا غیظ و غضب!

برنارڈ لیوس / مسلم سجاد

برنارڈ لیوس (Bernard lewis) ایک انتہائی ممتاز اور ذی علم "ماہرِ اسلام" شمار ہوتے ہیں۔ درجنوں کتابوں اور مقالوں کے مصنف ہیں۔ بدقسمتی سے ان کی کوئی تحریر مشکل ہی سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر فشانی سے خالی ہوتی ہے۔ لیکن کیونکہ ان کا ہر لفظ مغرب میں وقعت رکھتا ہے اور اس کے ذہن کی تعمیر پر اثر انداز ہوتا ہے' اس لیے اسلام اور مغرب کے درمیان تہذیبی کشمکش کے اس دور میں ان کے نقطہ نظر سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اس ضمن میں ان کا ایک اہم مضمون ماہنامہ اٹلانٹک ستمبر ۱۹۹۰ (The Atlantic) کے شمارہ میں شائع ہوا' جس کی تلخیص ہمارے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی۔

امریکا نے گزشتہ دو صدیوں میں' مذہب اور ریاست کی علاحدگی کے تصور پر' جس کی بنیاد عیسائیت میں تلاش کی جا سکتی ہے' اپنی زندگی کی تعمیر کی ہے۔ لیکن اسلام نے مذہب اور سیاست کی یک جائی کا ایک مختلف تصور پیش کیا ہے۔ اسلام نے یقیناً انسانیت کو عظیم روایات سے مالا مال کیا ہے' لیکن ایسے دور بھی آئے جب اس نے اپنے پیروکاروں میں نفرت اور تشدد کے جذبات ابھارے ہیں۔ آج مسلمان دنیا کے کچھ حصوں میں اسی کیفیت سے گزر رہے ہیں اور بدقسمتی سے اس کا ہدف ہم مغرب کے لوگ ہیں۔

مسلم دنیا مغرب کو مسترد کرنے میں یک آواز نہیں ہے۔ بڑی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے مغربی اقدار کو اپنا لیا ہے۔ لیکن دوسری طرف مغرب کے خلاف نفرت کی ایسی لہر ہے جس نے امریکیوں کو خوف اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ نفرت مغرب کے کسی اقدام یا پالیسی سے بڑھ کر' مغربی تہذیب کے اصولوں اور تصورات سے ہے۔ یہ مجسم شر ہے۔ اس کو

ماننے والے خدا کے دشمن ہیں۔ قرآن کے مطابق بھی' خیر و شر کی کشمکش مستقل ہے۔ یہ کشمکش سیاسی اور فوجی دائروں تک وسعت رکھتی ہے۔ انسانیت دارالاسلام اور دارالکفر میں تقسیم ہے۔ اس وقت دنیا کا بیشتر حصہ دارالاسلام سے باہر ہے۔ مسلم ممالک میں بھی اسلامی قوانین رائج نہیں ہیں۔ اس لیے جہاد کا فرض گھر سے شروع ہوتا ہے اور باہر بھی جاری رہتا ہے۔

مسلم عیسائی کشمکش

اپنے دورِ عروج میں مسلمانوں نے اپنا اصل حریف عیسائیت کو سمجھا۔ اس لیے کہ یہ عالمی مذہب تھی' اس کی اپنی تہذیب تھی' اپنی سلطنت تھی جو ان سے چھوٹی سہی' لیکن امیدوں اور وعدوں میں آگے تھی۔ عیسائی دنیا اور یورپ ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے تھے۔

ان دو حریف نظاموں میں ۱۴ سو سال سے کشمکش جاری ہے۔ تین صدی قبل' ۱۶۸۳ میں وی آنا کے محاصرہ میں ترکوں کی ناکامی کے بعد سے اسلام دفاع پر ہے۔ عیسائی اور یورپی تہذیب نے پوری دنیا کو بشمول مسلم دنیا' اپنے دائرہ اثر میں لے لیا ہے۔ پہلے مرحلہ میں دنیا پر مسلمانوں کا غلبہ ختم ہوا۔ دوسرے مرحلہ میں' وہ اپنے ممالک میں بھی اقتدار سے محروم ہو گئے' اور آخری تنکا یہ ثابت ہوا کہ وہ اپنے گھروں میں بھی حکمران نہ رہے۔ عورتوں نے آزادی اور بچوں نے بغاوت کا راستہ اختیار کر کے انھیں چیلنج کر دیا۔ یہ مسلمانوں کے لیے برداشت سے باہر ہو گیا۔ مسلم اقتدار اور عظمت کو بحال کرنے کے جذبہ سے مغرب کے خلاف بغاوت کا آغاز ہوا۔ غصے اور نفرت کی کیفیت پیدا ہوئی۔ یہ فطری بات تھی کہ یہ تحریک قدیم عقائد سے قوت حاصل کر لے۔

پھر حالات میں ایک بڑی تبدیلی آئی۔ امریکا نے مغرب کی قیادت سنبھال لی۔ وسیع اور وسعت پذیر مذہبی احیا کے قائدین نے اچانک ہی امریکا کو ہر برائی کا مظہر اور ہر اچھائی کا مخالف اور خصوصاً مسلمانوں کا اور اسلام کا اصل دشمن قرار دینا شروع کر دیا۔

مسلم رویہ کی وجوہات

اس مغرب دشمن بلکہ امریکا دشمن رویہ کی وجوہات تیسرے عشرے میں جرمنی کے دانشوروں کی امریکا مخالف فکر کے مسلمانوں پر اثرات' اور اس کے بعد روس کی جانب سے امریکا کی سرمایہ داری کی مذمت میں بھی تلاش کی جا سکتی ہیں۔ تیسری دنیا میں ایک مقبول رجحان یہ بھی تھا کہ مشرق سادہ اور معصوم ہے اور مغرب چالاک اور عیار ہے۔ لیکن یہ فلسفے مسلم دنیا کے مغرب دشمن رویے کی مکمل توجیہ نہیں کرتے۔

اس نفرت اور دشمنی کی اصل وجہ کچھ اور ہی ہے!

یقیناً مغربی حکومتوں کے ایسے اقدامات کم نہیں ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے جذبات کو بھڑکایا۔ لیکن پالیسیاں ترک کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ فرانس الجیریا سے' برطانیہ مصر سے' مغرب کی علامت شاہ' ایران سے اور تیل کمپنیاں کنوؤں سے چلی گئیں' لیکن بنیاد پرستوں اور دوسرے انتہا پسندوں کا غیظ و غضب برقرار ہے' بڑھ رہا ہے' کم نہیں ہوتا۔

اسرائیل کے لیے امریکا کی حمایت بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ لیکن روس نے تو امریکا سے پہلے اسرائیل کی حمایت کی۔ اس کے باوجود مصر' شام' عراق سب کے روس سے دوستانہ تعلقات رہے۔

ایک تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ امریکا ان ممالک کی ظالم اور بدعنوان حکومتوں کی حمایت کرتا ہے۔

لیکن یہ وجوہات کافی نہیں۔ آخر ایسی گہری بات کیا ہے کہ جس کی وجہ سے ہر اختلاف' مسئلہ بن جاتا ہے اور ہر مسئلہ لاینحل ہو جاتا ہے۔

مغرب سے نفرت کیوں

امریکا کے خلاف نفرت مسلم دنیا تک محدود نہیں ہے۔ تیسری دنیا میں موجود اس نفرت کی پہنچ خود امریکا تک ہے جس کا اظہار یہاں کیا جاتا رہتا ہے۔ ہم پر تین الزام ہیں : جنسی امتیاز و تفریق' نسل پرستی اور استعماریت۔ ہم ان الزامات پر اعترافِ جرم کرتے ہیں۔ امریکی اور مغربی ہونے کی حیثیت سے نہیں' بلکہ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے۔ لیکن ان گناہوں کے گناہگار صرف ہم ہی نہیں ہیں اور بعض کے مقابلہ میں بدترین بھی نہیں ہیں۔

خواتین سے سلوک عیسائی دنیا میں ظالمانہ اور غیر مساویانہ رہا ہے لیکن اپنی بدترین شکل میں بھی یہ کثرتِ ازدواج اور حرم کی روایت سے بہتر تھا۔

غلامی کو آج بھی جائز قرار دینے والے موجود ہیں لیکن یہ مغرب تھا جس نے سب سے پہلے اسے غیر قانونی قرار دیا۔

پھر' کیا استعماریت ہمارا قصور ہے ؟ لیکن کیا عربوں' منگولوں اور عثمانیوں کے مقابلے میں ہمارا اخلاقی کردار زیادہ خراب تھا؟

عورت کی تحقیر' نسل پرستی اور استعماریت اختیار کرنے میں ہم اس راہِ عمل پر چل رہے تھے جس پر ساری انسانیت چلی ہے۔ ہم ممتاز ہیں تو اس لحاظ سے کہ ہم نے ان خرابیوں کو محسوس کیا اور

دور کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔

سب سے زیادہ ہم پر استعماریت کا الزام ہے۔ مگر اس میں تو روس ہمارا شریک ہے۔ اور امریکا پر تو فلپائن کے ایک علاقے کے علاوہ کسی مسلمان ملک پر قبضہ کرنے کا الزام نہیں ہے۶۔

بنیاد پرستوں کا مغرب پر ایک بڑا الزام اس کا سیکولرزم ہے۔ مگر مسلم علاقے تو ابھی تک روس کے مقبوضہ تھے۔ لیکن روس کے خلاف کوئی احتجاج نہیں ہوتا' شاید اس لیے کہ روس کا سیکولرزم خطرہ کا باعث نہیں ہے۔

مغرب کی ایک اور برائی پرکشش ساز و سامان سے بھرپور زندگی (consumerism) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے اثر سے آنے والے اجتماعی اور معاشی تصورات نے اور سیکولرزم اور consumerism نے مسلم معاشرہ میں واضح تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ اور مغربی سرمایہ داری اور جمہوریت نے روایتی اسلامی فکر اور طریقِ زندگی کا ایک پرکشش متبادل پیش کر دیا ہے۔ اس لیے بنیاد پرستوں کے رہنما مغربی تہذیب کو اپنے طریقِ زندگی کے لیے سب سے بڑا چیلنج سمجھنے میں غلطی پر نہیں ہیں۔

تہذیبوں کا تصادم

مغرب میں چرچ اور ریاست کے دو علاحدہ اداروں کی روایت کی بنیادیں عیسائی تعلیمات اور عملی تجربے میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اسلام میں اس سیکولرزم کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسلام مختلف عقائد رکھنے والوں کو نظری اور عملی کسی طرح بھی برابر کا مقام نہیں دیتا۷۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلامی حکومتوں میں دوسرے مذاہب کے ماننے والے رواداری کی ایسی فضا میں رہے جس کی کوئی مثال عیسائی دنیا پیش نہیں کر سکتی۔

مغربی تہذیب کے لیے مسلمانوں کا اوّلین ردِعمل تحسین اور تقلید کا تھا' لیکن موجودہ دور میں مذمت اور مخالفت نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اس کی ایک وجہ ایک قابلِ فخر غالب تہذیب کے وارث کی حیثیت سے ان کا اپنی تحقیر کا یہ احساس ہے کہ ان پر ان سے کمتر لوگوں نے غلبہ حاصل کر لیا ہے۸۔ تاہم مغربی اثرات کے تحت مسلم معاشروں میں ایک مغرب زدہ طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو اپنے لباس اور رہن سہن میں عوام سے جدا ہے۔ ان کی حاکمانہ حیثیت کی وجہ سے مسلم معاشروں میں مغربی تصورات کو اختیار کیا گیا' لیکن یہ تجربے خوشگوار نہیں رہے۔ مغربی طرز کے سیاسی ادارے ظلم و استبداد' مغربی طرز کے معاشی ادارے غربت' اور مغربی طرز کی فوجیں ان کے لیے شکست لے کر آئیں۔ تعجب نہ ہونا چاہیے اگر ان حالات میں ان کی سنی گئی جو کہتے تھے کہ پرانے اسلامی طریقے ہی

بہترین تھے۔ نجات کی راہ یہی ہے کہ اللہ کی سیدھی راہ کی طرف پلٹ آئیں۔

بنیاد پرستی کی جدوجہد دو دشمنوں کے خلاف ہے: سیکولرزم اور ماڈرنزم۔ سیکولرزم کے خلاف لڑائی واضح ہے۔ اس پر وسیع لٹریچر موجود ہے۔ لیکن ماڈرنزم کے خلاف لڑائی واضح نہیں ہے۔ یہ اس جدید رجحان کے خلاف ہے جس نے گذشتہ صدی میں سیاسی، معاشی اور تہذیبی اداروں کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ مسلمان عوام ان قوتوں کے خلاف غیظ و غضب محسوس کرتے ہیں جنھوں نے ان کی روایات کی تحقیر کی ہے، انھیں عقائد سے محروم کیا ہے اور ان کی روزی بھی چھین لی ہے۔ بنیاد پرستی نے اس غیظ و غضب کو مقصد اور سمت دی ہے۔

اسلام کے اندر کوئی ایسی بات ہے کہ ایک عام دیہاتی بھی دوسروں کے ساتھ اخلاق اور شائستگی سے پیش آتا ہے لیکن جب جذبات میں ابال ہو تو اغوا اور قتل بھی کیے جاتے ہیں ۹۔ اور رسول اللہؐ کی زندگی سے اس کے لیے مثال بھی حاصل کر لی جاتی ہے۔

مغرب کو ملزم سمجھنے میں مسلمان عوام کا وجدان غلطی پر نہیں ہے۔ یورپی تہذیب کے وارث اور راہنما کی حیثیت سے امریکا غیظ و غضب کا نشانہ بن گیا ہے۔ ۱۹۷۹ میں خانہ کعبہ پر قبضہ اور پھر سلمان رشدی کی کتاب کی اشاعت کے مواقع پر اسلام آباد میں عوام کے ہجوم نے سارا غصہ امریکا پر اتارا حالانکہ دونوں واقعات میں امریکا کا کوئی قصور نہ تھا۔

دراصل ہم ایک ایسی تحریک کا سامنا کر رہے ہیں جو حکومتوں، مسائل اور پالیسیوں سے ماورا ہے۔ یہ تہذیبوں کا تصادم ہے۔ یہ ہمارے یہودی عیسائی ورثہ، ہمارے سیکولر حال اور ان دونوں کی ساری دنیا میں اشاعت کے خلاف ردِّعمل ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مغرب سے درآمد تصورات کو بالکل مسترد نہیں کیا گیا ہے۔ کچھ تو انتہا پسند بنیاد پرستوں نے بھی قبول کر لیے ہیں۔ ان میں سے ایک سیاسی آزادی ہے۔ اس کے ساتھ انتخابات اور دستوری حکومت کا تصور ہے۔ کچھ ثقافتی علامات بھی موجود ہیں مثلاً مردوں کا لباس خصوصاً" فوج میں۔ اسی طرح کوکا کولا، ٹینک، ٹی وی ایسے مظاہر ہیں جن کی جلو میں تصورات بھی مضبوط ہوئے ہیں۔

مسلم دنیا میں صرف بنیاد پرستی ہی اسلامی روایت نہیں ہے۔ دوسری روایات میں زیادہ رواداری اور گنجائش ہے۔ ہم امید کر سکتے ہیں کہ وقت گزرنے پر یہ غالب آئیں گی۔ لیکن اس سے پہلے خود ان کے درمیان شدید جدوجہد ہو گی جس میں ہم مغرب کے لوگ شاید کچھ نہ کر سکیں۔ یہ مسائل مسلمانوں کو خود حل کرنا چاہئیں۔ یہ خطرہ ضرور ہے کہ مذہبی جنگوں کا سلسلہ نہ شروع ہو جائے۔

آخری بات یہ ہے کہ ہمیں دوسرے تہذیبی اور سیاسی کلچروں کا ان کی تاریخ، کارناموں اور لٹریچر

کے مطالعہ سے بہتر فہم حاصل کرنا چاہیے۔ امید کرنا چاہیے کہ وہ بھی ہمارا بہتر فہم حاصل کریں گے اور مذہب اور سیاست کے ہمارے تصور کو اختیار چاہے نہ کریں، مگر اس کا احترام کریں گے۔

۱۔ یہ عجیب بات ہے کہ عیسائیوں، یہودیوں اور بودھوں وغیرہ میں تو نفرت و تشدد کے جذبات کے لیے ان کے مذاہب کو ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جاتا، لیکن مسلمانوں کے معاملہ میں الزام اسلام کے سر ڈالا جاتا ہے۔

۲۔ مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے اصولوں اور تصورات سے یقیناً شدید اختلاف ہے، لیکن مغرب کے خلاف ان کے جذبات کی شدت کی وجہ یہ اختلاف نہیں، بلکہ مسلمانوں کے خلاف مغرب کی استعماری طاقتوں کے عسکری، سیاسی، معاشی، اور تہذیبی اقدامات ہی ہیں۔

۳۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ایک ہزار سال تک عیسائی، مسلمانوں کو اپنا اصل دشمن سمجھتے رہے، اور ان کے خلاف نفرت اور معرکہ آرائی میں مبتلا رہے۔ مسلمانوں نے تو ہر جگہ عیسائیوں کو پوری آزادی اور اکرام کے ساتھ رکھا۔

۴۔ ان میں سے کوئی بھی بخوشی نہیں گیا۔ الجیریا سے جس خون ریزی کے بعد فرانس گیا، وہ ایک مثال ہے اس بات کی کہ یہ جانا کس طرح ہوا۔ پھر غیظ و غضب کم کیوں کر ہوتا۔

۵۔ روس نے آغاز میں اسرائیل کو تسلیم ضرور کیا۔ لیکن جلد ہی بات سرد مہری اور پھر سفارتی تعلقات کے انقطاع تک پہنچ گئی۔ اس کے برعکس امریکا تو دل و جان اور دام و درہم سے آج تک اسرائیل کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ دونوں کو مساوی رکھنا تاریخی بددیانتی کی ایک بھونڈی مثال ہے۔

۶۔ براہ راست سیاسی قبضہ تو نہیں، لیکن معاشی تسلط اور بالواسطہ سیاسی غلبہ کون نہیں دیکھ سکتا۔

۷۔ اتنا برابر بھی نہیں جتنا یورپ میں برنارڈ لیوس کے ہم مذہب یہودیوں کو دیا گیا!

۸۔ مسلمانوں کا اولین ردعمل تو مغربی استعمار کے خلاف مسلح جدوجہد کا تھا، انڈونیشیا میں، ہندوستان میں جنگ آزادی، لبنان اور شام میں فرانس کے خلاف، سوڈان میں مہدی کا، مراکش میں عبدالکریم ریفی کا جہاد اس کی مثالیں ہیں۔ رخصت ہو جانے کے باوجود بالا دستی سے، اور عسکری بے بسی سے نفرت و عزمت میں اضافہ ہوا ہے۔ اس سے بڑھ کر آزاد مسلمان ملکوں پر حکمرانوں کے جبر و استبداد کی پشت پناہی اور مسلمان عوام میں اس لہر کی مخالفت کہ وہ اپنی زندگی کی تعبیر اپنے دین و ایمان کے مطابق کریں۔

۹۔ مسلمان تو ظلم و ستم کا شکار ہیں اور طاقت سے محروم، اس لیے ایسی چند کارروائیاں ہو گئی ہیں۔ مگر عدم تشدد کے علمبردار بودھوں اور ہندوؤں اور عیسائی سربوں کے لیے کیا جواز ہے؟

اسلامی تحریکیں: ماضی اور حال

جدید عالمی نظام اور اسلام

خلیل احمد حامدی

مغرب اور اسلامی تحریکات

اسلامی تحریکوں کی فکری کامیابی اور عملی پیش رفت کو دیکھ کر مغربی طاقتیں جن کی قیادت' بلکہ نکیل' امریکہ کے ہاتھ میں ہے' اسلامی تحریکوں پر ٹوٹ پڑی ہیں' اور اپنے دست آموز مسلم حکمرانوں کے ذریعے ان کو ناپید کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان طاقتوں کا واحد ہدف اسلامی تحریکیں ہیں جسے پورا کرنے کے لیے انھوں نے کئی محاذ کھول رکھے ہیں۔ فکری محاذ پر تحریکوں کو "بنیاد پرست" اور "دہشت گرد" مشہور کیا جا رہا ہے۔ سابقہ دور میں ان کے لیے "رجعت پسندی" اور "ترقی دشمنی" کے خطابات تھے۔ جب تک کیمونزم اور اس کی علمبردار طاقت سوویت یونین صفحہ ہستی پر موجود تھے' امریکہ اسلامی تحریکوں کو دشمن کا دشمن سمجھ کر اپنی عالمی حکمت عملی بناتا رہا۔ ایک طرف اسلامی تحریکوں کو دبانے کی کوشش کرتا رہا اور دوسری طرف انھیں کیمونزم کے خلاف ایک کارگر ہتھیار سمجھ کر ان کے وجود سے استفادہ کرتا رہا۔ اور یہ بھی اس کی پالیسی رہی کہ اسلامی تحریکیں اور کیمونسٹ تحریکیں باہم دست و گریباں رہیں اور دونوں کے پر کٹتے رہیں۔ اس پالیسی کا نمایاں عکس ہمیں سوڈان' مصر اور شام کے واقعات میں ملتا ہے۔ سقوط کیمونزم تک امریکہ کی یہی دو رخی پالیسی رہی۔

اب امریکہ کا واحد دشمن اسلامی تحریکیں ہیں' اور وہ یک قطبی عالمی نظام کے تصور میں مست ہو کر فیلِ بے زنجیر کی طرح اسلامی تحریکوں کو کچلنا چاہتا ہے۔ مسلمان حکمرانوں کی کمزوری' بے دینی اور جاہ پرستی ان مذموم مقاصد کی برآری کے لیے اسے مواقع مہیا کر رہی ہے۔ اس غرض کے لیے اس نے عالم اسلام کے اندر "کنٹرولنگ سنٹرز" قائم کر لیے یا قائم کر رہا ہے۔ شرقِ اوسط کو زیر بار رکھنے کے لیے اس نے "اسرائیل" کو مستحکم کر دیا ہے' اور اسرائیل امریکہ ہی کی ایک ریاست ہے۔ اسے عسکری' اقتصادی اور ثقافتی طور پر اس قدر مسلح کر دیا گیا ہے کہ پورے شرق

اوسط پر اسرائیل کی سیادت ہو گی۔ عربوں کی منڈیاں اس کے ہاتھ میں ہوں گی' ثقافتی یلغار شروع ہو چکی ہے۔ اسرائیل کی عسکری طاقت کے مقابلے میں پورے شرقِ اوسط کی مجموعی عسکری طاقت بونی نظر آتی ہے۔ عراق مضبوط عسکری طاقت بن گیا تھا۔ اسے ہمیشہ کے لیے تحلیل کر دیا گیا ہے۔ ثقافتی یلغار کے اثرات اس مثال سے واضح ہو سکتے ہیں کہ مصر کے تعلیمی نصاب سے وہ تمام آیاتِ قرآنی خارج کر دی گئی ہیں جو یہود کی مذمت کرتی ہیں یا جہاد کی دعوت دیتی ہیں۔ شرقِ اوسط اور خلیجی ممالک میں اسلامی تحریکوں سے وابستہ عناصر کو سرکاری اداروں سے نکالا جا رہا ہے۔ ہر نوع کی تبلیغی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ اور "بنیاد پرستی" کو کنگھیوں سے صاف کرنے کی مہم شروع ہو چکی ہے۔ شمالی افریقہ (مراکش' الجزائر' تونس اور لیبیا) میں امریکہ کا "مرکزِ نگہداشت" مراکش ہے۔ پورے شمالی افریقہ' بلکہ مغربی افریقہ کے بعض ممالک (مثلاً موریطانیہ اور سینی گال) کی نگیل بھی اس مرکز کے ہاتھ میں ہے اور ان ممالک پر شدید دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اسلامی تحریکوں کی سرکوبی کریں۔

جدید عالمی نظام اور اسلام

امریکہ اب "جدید عالمی نظام" کا ہتھیار لے کر مسلمان ممالک میں اتر رہا ہے۔ اور جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے اس کا اصل ہدف اسلامی تحریکیں ہیں کیونکہ جدید عالمی نظام کا راستہ وہی روک سکتی ہیں۔ "جدید عالمی نظام" کے تجزیے تو بہت کیے گئے ہیں۔ اس کی اصل حقیقت کا انکشاف ان رویوں سے ہو گا جو اسلام اور عالمِ اسلام کے متعلق امریکہ اختیار کرے گا۔ اب تک اس کے جو "کرشمے" سامنے آئے ہیں' وہ یہ ہیں:

۱۔ عالمِ اسلام کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کرنا۔ مغربی استعمار اور امریکہ کی یہ کوئی نئی پالیسی نہیں ہے۔ ان طاقتوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو تتر بتر کیے رکھنے کی کوششیں کی ہیں' لیکن "جدید عالمی نظام" کے تحت محض عرب اور مسلم ممالک کی تقسیم و تفریق مراد نہیں ہے۔ یہ تقسیم و تفریق تو بالفعل ہو چکی ہے اور عالم اسلام تقریباً ۶۰ چھوٹی بڑی ریاستوں میں منقسم ہے' بلکہ اب ایک ایک ملک کے اندر مزید انقسام و افتراق پیش نظر ہے۔ مثلاً ہم مسلسل یہ سن رہے ہیں کہ عراق کو تین حصوں میں بانٹا جا رہا ہے۔ شمالی عراق کردوں کے لیے' جنوبی عراق شیعہ آبادی کے لیے اور وسطی عراق سنیوں کے لیے۔ صومالیہ کو بھی جنوب اور شمال میں تقسیم کرنے کا منصوبہ ہے۔ بوسنیا و ہرزیگونیا کی ساری جنگ اس ملک کو تین مذہبی و نسلی بنیادوں پر تقسیم کرنے کے لیے ہے۔ ایک حصہ آرتھوڈکس سرب نسل کے لیے' دوسرا کیتھولک کروٹ نسل کے لیے اور تیسرا

مسلم بشناق نسل کے لیے۔ سوڈان کی طاقت کو بھی پاش پاش کرنے کے لیے جنوبی سوڈان کو بزور شمال سے الگ کرنے کی اسکیم جاری و ساری ہے۔ جنوب کی علیحدگی کے بعد مغربی سوڈان میں علیحدگی کی تحریک چلائی جائے گی۔ ترکی کے اندر کرد آبادی ترک قوم پرستوں سے مدتوں سے نالاں چلی آ رہی ہے۔ اب امریکہ اس صورت حال کا استحصال کر رہا ہے اور قوم پرست کردوں کو بغاوت کا درس دے رہا ہے' اور اس غرض کے لیے آرمینیا کے ارمنوں کو کردوں کے اندر ترکی کے اندر بغاوت کے لیے مدد دے رہا ہے۔ موریطانیہ اور سینی گال میں امریکی ایجنٹوں نے خانہ جنگی بھڑکا دی۔ سینی گال کے اندر موریطانیہ کے لوگ مدتوں سے رہ رہے تھے۔ وہ یکایک سینی گالیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بن گئے' اور دو مسلمان ہمسائے ملک چند نادان رہنماؤں کی وجہ سے باہم دست و گریبان ہو گئے۔ اس کے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوئے ہیں بلکہ عالمی نظام کے ایجنٹ اس آگ کو وقتاً" فوقتاً" سلگاتے رہتے ہیں۔ یہی سازش افغانستان میں چل رہی ہے۔ فلسطین کے مسئلے کو جس طرح امریکہ نے حل کیا ہے وہ مسلمانوں کو عقل کے ناخن لینے کے لیے کافی ہے۔ یاسر عرفات کو اسرائیل کے پاؤں میں بٹھا دیا ہے' اور غزہ اور اریحا کی بلدیات کی معمولی خدمات اس کے سپرد کر دی ہیں۔ کشمیر کو بھی جدید عالمی نظام تین حصوں میں بانٹنا چاہتا ہے۔ جموں اور لداخ بھارت کے پاس رہیں' آزاد کشمیر پاکستان کو دے دیا جائے' اور وادیِ کشمیر کو' جہاں تحریکِ جہاد برپا ہے' خودمختار حیثیت دے کر اسے امریکہ کا عسکری اڈہ بنا دیا جائے' تاکہ امریکہ وہاں سے پاکستان' افغانستان اور وسط ایشیا کی مسلم جمہوریتوں کو آسانی سے قابو میں رکھ سکے۔ ان تفریقی فتنوں کو برپا کرنے کے لیے امریکہ نسلی' لسانی' تہذیبی اور مذہبی مسائل کھڑے کر رہا ہے۔ خود پاکستان کے اندر امریکہ نے تینوں طرح کے مسائل جنم دے رکھے ہیں۔ سندھ کے شہروں میں لسانی تحریک' سندھ کے اندر نسلی نعرے' ملتان اور بہاولپور کے علاقے میں **"سرائیکستان"** کی آواز اور اہلِ مذہب کے اندر باہمی جنگ۔ یہ سب دانستہ یا نادانستہ نیو ورلڈ آرڈر کی لہروں کے کرشمے ہیں۔

۲۔ مسلم ممالک کو جدید ٹیکنالوجی سے محروم رکھنا یا ان کے اندر اس کی ملکیت کی صلاحیت نہ ابھرنے دینا۔ خواہ وہ مسلم ممالک امریکہ کے دشمن ہوں یا دوست۔ خلیج کی جنگ نے جدید ٹیکنالوجی کی اہمیت کو واضح کر دیا ہے۔ مغرب' ٹیکنالوجی پر اپنی اجارہ داری کے ذریعے اپنے متعدد مفادات و مقاصد بروئے کار لانا چاہتا ہے۔ مثلاً وہ اسلحہ مارکیٹ کا واحد مالک بننا چاہتا ہے' مسلمانوں کو اس سلسلے میں پسماندہ اور کمزور رکھنا چاہتا ہے' اور عرب ممالک میں اپنے حلیف اسرائیل کی عسکری

فوقیت برقرار رکھنا چاہتا ہے' اور اس کی بدولت وہ صیہونی ریاست کے ارد گرد سیکورٹی بیلٹ وجود میں لانا چاہتا ہے۔ امریکہ کو یہ خطرہ ہے کہ مسلم ممالک میں "بنیاد پرستی" روز افزوں ہے اور آیندہ کسی وقت بھی زمام اقتدار بنیاد پرستوں کے ہاتھ آ سکتی ہے۔ اس لیے امریکہ ٹیکنالوجی میں مسلم ممالک کو خود کفیل ہونے کے بجائے اپنا دست نگر رکھنا چاہتا ہے۔

۳۔ فلسطین کے مقبوضہ علاقوں کی آبادکاری کے لیے سابقہ روس اور یمن' مراکش میں رہنے والے یہودیوں کو فلسطین لانے کی منصوبہ بندی' تاکہ فلسطین کے اندر آبادی کا توازن یہودیوں کے ہاتھ میں رہے۔ اس وقت فلسطین کی عرب آبادی میں شرح پیدائش کا تناسب یہودی آبادی کے مقابلے میں دس گنا زیادہ ہے' اور اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو چند سالوں میں عربوں کی غالب اکثریت وجود میں آ جائے گی' جسے قابو میں رکھنا امریکہ اور اسرائیل کے بس میں نہ ہو گا۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے امریکہ باہر کے یہودیوں کو لا کر فلسطین میں آباد کرنا چاہتا ہے۔ امریکہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ دنیا کے اندر بکھرے ہوئے یہودی خود امریکہ میں آ جائیں اور وہاں مزید امریکی پالیسیوں پر اپنا غلبہ پا لیں۔

۴۔ عالم اسلام کا اقتصادی محاصرہ' ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے ذریعے۔ امریکہ ان مسلم اور عرب ممالک پر جو ترقی کی راہ پر گامزن ہو رہے ہیں مذکورہ دونوں اداروں کی وساطت سے یہ پالیسی نافذ کرنا چاہتا ہے کہ ان کے تمام وسائل مغربی اقتصادیات' بالخصوص امریکی اقتصادیات کی خدمت کے لیے وقف رہیں۔ اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے امریکہ متعدد نائٹل متعارف کرا رہا ہے۔ مثلاً عرب اور مسلم ممالک اپنی نیشنل اکانومی کو انٹرنیشنل اکانومی میں مدغم کر دیں یا پرائیویٹائزیشن کا نعرہ جس کے ذریعے امریکہ مسلم و عرب ممالک کے مالی اداروں کو ان کی حکومتوں سے بالا بالا بین الاقوامی تحویل میں لینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پرائیوٹ سیکٹر میں پائے جانے والے مالی ادارے آسانی سے قابو کیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح مسلم اور عرب ممالک اپنے بنیادی اقتصادی نظام کو کبھی مستحکم نہ کر سکیں گے۔

۵۔ اسلامی تحریکوں کے خلاف ویٹو پاور کا استعمال' تاکہ وہ کبھی اقتدار تک نہ پہنچ سکیں۔ امریکہ یہ کام آمرانہ حکومتوں کے ذریعے بہ آسانی لے سکتا ہے۔ سیکولر اپوزیشن بھی امریکہ کی اس اسکیم کو پورا کرنے میں ممد و معاون ہو سکتی ہے۔ اور جس طرح بعض افریقی ممالک میں ہو چکا ہے' امریکہ جہاں بھی اسلامی تحریک کی پیش رفت دیکھے گا وہاں فوجی انقلاب کے لیے سبز جھنڈی دکھا دے گا۔

۶۔ چونکہ مسلمان اپنے اسلامی عقیدے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں' اس لیے مسلمانوں کے عقیدے اور مذہب کو چھیڑے بغیر مسلمانوں کی نئی نسل کے اندر اباحیت کو رواج دیا جائے۔ گو یہ قدیم یہودی منصوبہ ہے' لیکن اب امریکی ماہرین اس کے نفاذ پر مسلسل زور دے رہے ہیں۔ علی الخصوص ایسے سمعی اور بصری آلات و وسائل سے مدد لی جا رہی ہے جو اپنا بین الاقوامی جال بچھا چکے ہیں۔ ترویجِ اباحیت کے لیے سب سے بڑا ذریعہ عورت ہے۔ مرد و زن میں مساوات کے نام سے عورتوں کو بے راہ رو کر دینا مغرب کی پرانی اسکیم ہے' جسے نئے سرے سے جامہ عمل پہنایا جا رہا ہے۔ خلیجی جنگ کے دوران ریاض جیسے شہر میں سیکولرزم کے علمبرداروں نے عورتوں کا جلوس نکالا جس میں عورتوں نے اپنے "حقوق" کا مطالبہ کیا۔ کویت میں عورت تمام روایات کو توڑ چکی ہے۔ اس سلسلے میں ایک خاص نقطہ مغربی ماہرین نے یہ اختیار کیا ہے کہ "اسلام" کی اصطلاح عالمی نشریاتی اداروں میں استعمال نہ کی جائے۔ اس کے لیے "بنیاد پرستی" اور دیگر اصطلاحات جو مستقبل میں حسبِ ضرورت وضع کی جائیں' استعمال کی جائیں۔ مستقبل قریب میں ایک نئی اصطلاح نشریاتی اداروں کے ذریعے رواج دی جائے گی اور وہ ہے "عقل پرستی"۔ راسخ العقیدہ مسلمانوں کو "عقل پرستی" کا مخالف ثابت کیا جائے گا۔ پیشتر ازیں مجاہدین کو "دہشت گرد" کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔

ملتِ اسلامی کو بیدار کرنے اور اسے اپنے تشخص سے روشناس کروانے کا کام کوئی معمولی نہیں ہے۔ خاص طور پر ان حالات میں جبکہ اسے محوِ خواب رکھنے اور عبودیت کی زندگی پر قانع کرنے کا کام بھی زور و شور سے جاری ہو' تعلیمی ادارے اسی "خواب پسندی" کو دماغوں میں اتار رہے ہوں' ذرائع ابلاغ اسی کو مرغوب کر کے پیش کر رہے ہوں' معاشی گورکھ دھندے بھی ملت کو اسی گرداب میں دھکیلے جا رہے ہوں' اور پھر دنیا کی بڑی طاقتیں بھی ملتِ اسلامی کے خلاف صف آرا ہو چکی ہوں۔ اسلام کے صحیح تصور کا احیا' اسلام اور جاہلیت کا امتیاز' جہاد کی تشویق اور پھر ایک نئی مجاہد' جانفروش اور خود دار نسل کی فراہمی اسلامی تحریکوں کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل اور بنیادی کام یہی تھا جو تحریکوں نے سرانجام دے لیا ہے۔ اب اس کی مدد سے مکمل تہذیبی انقلاب کا مرحلہ باقی ہے۔ تحریکیں اسی دوسرے مرحلے میں داخل ہیں۔ اب پورے تیار شدہ مواد کو لے کر اور اس میں مزید پختگی اور وسعت پیدا کر کے کس طرح تہذیب اسلامی کی بالاتری کا قصر تعمیر کیا جائے' یہ ایک سوال ہے جو تحریکوں کو درپیش ہے۔

(ختم شد)

وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ

اُس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ ہوائیں بھیجتا ہے بشارت دینے کے لیے اور تمہیں اپنی رحمت سے بہرہ مند بنانے کے لیے۔



میں ـــ کہ زندگی ہوں!

رضی احمد صدیقی

میں کب وجود میں آیا' یہ تو میں نہیں جانتا اور غالباً" کوئی بھی نہیں جانتا۔ بس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والی بات ہے۔ مگر یہ طے ہے کہ اس کرہ ارض کی پیدائش کے ساتھ ہی میں وجود میں آگیا تھا۔ جب یہ زمین پیدائش کے عمل سے گزر رہی تھی اور صرف گیسوں کا مجموعہ تھی' اس وقت میرے ماں باپ بھی موجود تھے۔ میری ماں آکسیجن قد و قامت میں میرے باپ ہائیڈروجن سے آدھی تھی' اور وزن میں تو اتنی ہلکی پھلکی کہ ایک اور سولہ کی نسبت تھی۔

پھر میں پیدا ہوا تو کرہ ارض کی رگ رگ میں اتر کر اتھاہ گہرائیوں تک پہنچ گیا۔ مجھے خالق کائنات نے وہ صفات عطا کیں' اور وہ مقام دیا' جو شاید کسی کے بھی نصیب میں نہیں۔ میں مائع' ٹھوس اور گیس' ہر صورت میں ہمہ وقت موجود رہتا ہوں۔ میں ماحول سے مطابقت کا بڑا قائل ہوں کہ جینے کا قرینہ ایسے ہی آتا ہے۔ اگر بدل سکو تو اپنے مزاج کے مطابق ماحول بدل دو ـــ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر ماحول کے مطابق اپنے راستہ پر چلو' یا سمجھوتہ کر لو۔ ورنہ مٹ جاؤ گے اور تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں ـــ یہ سمجھوتے اور ماحول سے مطابقت بہرحال میری فطرت' میرا مزاج اور میری اصلیت نہیں بدل سکتے۔

جی تو میرا چاہتا ہے کہ مائع رہوں' خوب اچھل کود کروں کہ حرکت میں برکت ہوتی ہے' پھر آزادی بھی خوب' اور میری اصل شکل بھی یہی ہے ـــ لیکن اگر حالات تقاضا کر دیں تو ٹھوس ہو جانے میں بھی کوئی تامل نہیں۔ اور اگر بہنے کی بجائے فضا میں گیس کی مانند بلند ہونا ضروری ہو جائے' تو ابخرات بن کر بادل کہلوا کر فضائے بسیط میں خراماں خراماں چہل قدمی میں بھی لطف اٹھاتا ہوں۔ موقع اور حالات کے تقاضے ہوں تو فوراً مادر گیتی کی طرف برف' اولے یا پھر بارش کی صورت لپک پڑتا ہوں' کہ بہرحال چین تو آغوشِ مادری ہی میں ملتا ہے۔

اور ہاں --- ماں کو بھی میری بڑی تڑپ رہتی ہے' کہ زندگی کی ہر صورت میری ہی مرہون منت ہے۔ کہیں نہ جاؤں' نہ پہنچوں تو قحط کا سماں ہو جاتا ہے' ہری بھری کھیتیاں اجاڑ ہو جاتی ہیں' انسان' چرند پرند' حشرات الارض سب پر موت کے سائے منڈلانے لگتے ہیں۔ نہ کچھ کھانے کو رہتا ہے' نہ پینے کو --- کہ زندگی مجھ ہی سے عبارت ہے۔

میں نظر تو آتا ہی ہوں' مگر کبھی اوجھل بھی رہتا ہوں اور نمی اور سیلن کہلاتا ہوں۔ بالکل ہی پوشیدہ پتھروں اور معدنیات میں رہتا ہوں۔ پھیلتا ہوں تو ہزاروں میل کی وسعت کا سمندر ہوں' سمٹتا ہوں تو شبنم کا ننھا منا سا قطرہ جو پھولوں کی پنکھڑیوں پر بڑی نزاکت سے برا جمان ہوتا ہے۔ رگوں میں دوڑنے پھرنے اور آنکھ سے ٹپکنے میں بھی میں ہی شامل ہوں۔ میں جذبوں کا اظہار بھی ہوں' خواہ وہ خوشی کے ہوں یا غمی کے۔ ندامت کا پسینہ بھی میں ہی ہوں جسے شانِ کریمی موتی سمجھ کر چن لیتی ہے' اور سچ مچ کا موتی بھی سیپ کی کوکھ میں مجھ ہی سے جنم لیتا ہے۔

پہاڑوں کی اونچائیوں پر' جن میں سے بیشتر نے میرے اندر ہی پرورش پائی ہے' مجھے شوخیاں اور اٹھکیلیاں سوجھتی ہیں۔ اچھل کود' پتھروں سے کھیلنا اور الجھنا' شور مچانا مجھے بہت اچھا لگتا ہے کہ یہ میرے لڑکپن کا زمانہ ہوتا ہے --- اور لڑکپن کا زمانہ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ انھیں شوخیوں میں بہت سے پتھروں کو اپنا ہم سفر بنا لیتا ہوں۔ جو میرا ساتھ دینے سے انکاری ہوں' انھیں نوچتا ہوں' کھسوٹتا ہوں اور زخم لگاتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہوں' بڑے بڑے پتھر میرا ساتھ دیتے دیتے ہانپ جاتے ہیں' راستہ میں کہیں پناہ ڈھونڈ لیتے ہیں' اور میرے راستے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ ورنہ جو زخموں سے چور چور ہو کر ذرات میں تبدیل ہوں' منزل تک میرا ساتھ دیں' پھر ان کا ٹھکانہ سمندر ہو جاتے ہیں' جہاں وہ نڈھال ہو کر سمندر کی تہہ میں لاکھوں بلکہ کروڑوں سال کے لیے گہری نیند سو جاتے ہیں۔ جو ذرا سخت جان ہوتے ہیں' وہ میرے میدانوں میں آتے ہی' جب میری رفتار سست ہو جاتی ہے' ساتھ چھوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ منزل تک نہیں پہنچ پاتے' مگر راستہ میں بھی فنا' جلد یا بدیر' ان کا مقدر ہوتی ہے کہ فنا ہی میں بقا ہے' اور اسی فنا کے بعد انھیں پھر مصائب جھیل کر اور سختیوں سے گزر کر کندن بننا ہوتا ہے اور دوبارہ بلکہ بار بار پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیوں کی سربلندی نصیب ہوتی ہے۔

کبھی میں چشموں کی صورت ابلتا ہوں' کبھی یخ اور فرحت بخش مشروب کی صورت میں کہ پیا جاؤں تو رگوں میں تازگی اترتی چلی جائے' اور کبھی گرم اور اتنا گرم کہ ہاتھ ڈالو تو آبلے پڑ جائیں۔ یہ حدت اور تپش میں زمین کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنے ساتھ لاتا ہوں تاکہ زمین کے

طبقات اور گرم چٹانیں سکون پذیر ہوں۔ شدید گرمی کے ساتھ ساتھ میرے ساتھ بہت سی معدنیات بھی چل پڑتی ہیں' جو اپنے اپنے مزاج کے مطابق حدت میں کمی آنے کے ساتھ ہی الگ الگ ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جب تک میں سطح زمین پر آؤں بس گندھک ہی میری رفیق رہ جاتی ہے۔ میرے اندر رچی بسی یہ گندھک بہت سے امراض کا علاج بنتی ہے۔ میرے اندر کی شدید حدت اور تپش توانائی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔

یوں میں سارے کرہ ارض کی گہرائیوں' سطح اور فضا سب پر محیط ہوں۔ جہاں میں ہوں وہیں زندگی ہے' اور جہاں میرا وجود نہیں وہاں زندگی بھی مفقود ہے۔ زندگی کا آغاز بھی میری کوکھ ہی سے ہوا ہے اور رب کائنات نے مجھے وہ اعزاز بخشا ہے جس پر میں جتنا بھی ناز کروں کم ہے۔

میری روانی کو روک دو' اس پر قابو پالو' ذخیرہ کر لو' اور اپنی مرضی سے رواں کرو' تو نہروں کے ذریعہ دور دور تک پیاسی زمین کو سیراب کرتا چلا جاؤں کہ بنجر زمینوں سے لہلہاتی کھیتیاں ابھریں اور زندگی کی خوشیاں مسکرائیں۔ توانائی کے سوتے پھوٹیں' ہر طرف تیز روشنیاں جگمگائیں' کارخانے چلیں اور تہذیب اپنی ارتقا کی منازل جلدی جلدی طے کرتی بڑھتی چلی جائے۔ زندگی کو آسانیاں نصیب ہوں --- میں بپھر جاؤں تو سیلاب کی صورت بستیوں کی بستیاں اجاڑتا چلا جاؤں۔ قہرِ خداوندی بن جاؤں تو طوفانِ نوح ہو جاؤں۔

ایک معصوم شیرخوار پیاسے بچے کی ایڑیاں زمین سے رگڑیں' رحمتِ پروردگار جوش میں آئے' تو زمین سے ابل پڑوں اور پھر رواں رہوں' ایسے کہ دنیا بھر میں "آبِ زم زم" کہلاؤں اور ابدی عزت و احترام پاؤں۔ "پوتر جل" اور "ہولی واٹر" بھی میں ہی ہوں۔ اللہ نے میرے اندر خوراک کے ذخیرے بھی بے اندازہ جمع کر دیے ہیں' زمینی خوراک سے دل بھر جائے تو سمندری غذا کھاؤ کہ ہزار ہا قسم کی مچھلیاں میرے بطن میں تمہارے ہی لیے پرورش پاتی ہیں۔

ساری ناپاکیوں اور غلاظتوں کو دور کرنا' خواہ وہ زمین کی ہوں' فضا کی ہوں یا پھر انسانی اور حیوانی اجسام کی ہوں' میری صفت ہے۔ لیکن انسان کی پیدا کردہ آلودگی سے چھٹکارا پانے میں بے بس ہوں۔ ترقی' دن دونی رات چوگنی ترقی اور ہر قیمت پر ترقی اور تن آسانی' حد یہ ہے کہ چاہے اپنا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے' یہ حضرتِ انسان کا جنون بن گیا ہے' اور یہی جنون میرے اندر زہر بھر دیتا ہے --- یعنی زندگی میں زہر' اور جب میرے ساتھ ساتھ وباؤں اور نت نئے امراض کے اثرات دنیا بھر میں پھیلنے لگتے ہیں تو مجھے اپنے وجود سے شرم آتی ہے' مگر میں کر بھی کیا سکتا ہوں --- ؟

میری قدر کرو کہ میں زندگی ہوں --- زندگی کی قدر نہ کی تو زندہ کیسے رہو گے ؟

رسائل و مسائل

جمہوریت اور جماعت

۱۔ جماعتِ اسلامی جمہوریت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے جب کہ یہ غلط جمہوریت ہے۔
۲۔ عوام تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے صحیح فیصلہ نہیں کرتے۔ پھر جمہوریت کیسے چلے۔
۳۔ جماعت کی دعوت حق کی دعوت ہے، پھر ہمیں کامیابی کیوں نہیں ہوتی۔ ہمیں اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم سے کون سی غلطی سرزد ہو رہی ہے۔
۴۔ کیا اسلامی حکومت کا بھی وزیر اعظم ہو گا؟ اسلامی نقطہ نظر سے تو خلیفہ ہونا چاہیے۔
۵۔ کیا ہمارے پاس ایسا دستور ہے کہ پوری دنیا میں ایک اسلامی حکومت ہو، اور دنیا کے ممالک اس کے صوبے ہوں، جیسا کہ خلفائے راشدین کے دور میں ہوتا تھا۔

۱۔ صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ یہ جمہوریت غلط ہے، جب تک یہ نہ طے کیا جائے کہ کیوں غلط ہے۔ ایک غلط ہونا اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہ خلافِ اسلام ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات رہنمائی کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ یہ وہی جمہوریت ہے جس کی بحالی کے لیے سید مودودیؒ اور جماعتِ اسلامی نے طویل عرصہ جدوجہد کی اور تحریکیں چلائیں۔ یہ وہی جمہوریت ہے جو ۱۹۵۶ اور ۱۹۷۳ کے دساتیر میں ہم نے قبول کی۔ اب اس بحث کو دوبارہ اٹھانے کے لیے مضبوط دلائل ہونا چاہئیں، اور گذشتہ سارا لٹریچر سامنے ہونا چاہیے۔ صرف غلط ہونے کا فتویٰ دے کر اس پر سے گزر جانا صحیح نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ قواعد و ضوابط میں ایسی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے فساد پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے، اور ان کی اصلاح کی کوشش ضروری ہے۔ لیکن یہ اصلاح جمہوری ذرائع ہی سے ہو سکتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس پر عمل کرنے والوں کے کردار میں خرابیاں ہیں جن کی وجہ سے یہ غلط نظر آتی ہے۔ یہ وجہ اس لیے معقول نہیں کہ انسانوں کی خرابیوں کی وجہ سے

جمہوریت کو غلط نہیں کہا جا سکتا' جس طرح مسلمانوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے اسلام کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔

۲۔ عوام کی تعلیم و تربیت ضروری ہے' لیکن اس کا انحصار خواندگی پر نہیں۔ آج جو لوگ جمہوریت کی مٹی پلید کر رہے ہیں اور ملک کا ستیاناس کر رہے ہیں' وہ صرف خواندہ ہی نہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ سیاسی لیڈر' جنرل' بیوروکریٹ' تاجر' اساتذہ' ڈاکٹر' انجینئر' جو خرابیوں کا سرچشمہ ہیں' اسی زمرہ میں آتے ہیں۔

۳۔ دنیاوی ناکامی کی صورت میں ہمیں یقیناً ہمیشہ اپنی اخلاقی و تدبیری خامیوں کی تشخیص کرنا چاہیے' اور ان کا تدارک کرنا چاہیے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں کہ ہر ناکامی کی وجہ لازماً ہماری خامی ہی ہو گی۔ جو خامی سے پاک تھے' جیسے انبیا' وہ بھی بعض اوقات اپنی قوموں کو سمجھانے میں ناکام رہے۔

۴۔ قرآن و سنت میں یہ کہیں بھی نہیں لکھا ہوا کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کو خلیفہ کہلانا چاہیے۔ جب حضرت ابوبکرؓ پہلے خلیفہ منتخب ہوئے تو مسلمانوں نے انھیں خلیفۃ رسول اللہ کہنا شروع کیا۔ یہیں سے خلیفہ اور خلافت کا لفظ رائج ہو گیا۔ ورنہ معروف لقب ہمیشہ "امیر المومنین" رہا۔ سربراہِ حکومت وزیر اعظم بھی کہلا سکتا ہے' صدر بھی۔ ہر زمانہ کی اپنی اصطلاحات ہوں گی۔ جہاں اسلام نے واضح ہدایت نہیں دی' وہاں مسلمان آزاد ہیں کہ جو مناسب سمجھیں وہ کریں۔

۵۔ اسلام کی رو سے یہ بھی ضروری نہیں کہ ساری دنیا میں سارے ممالک کو ایک ہی حکومت کے تحت ہونا چاہیے۔ بنو امیہ کے بعد ہی اسپین میں علیحدہ خلافت قائم ہو گئی تھی۔ ہاں' ان کو باہم برسرِپیکار نہ ہونا چاہیے' اور ملتِ کفر کے سامنے یک جان ہونا چاہیے۔ (خ۔م)

علما کا فرض

آج ملک میں جو حالات ہیں اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ہے کہ علما نے اپنے فرائض کما حقہ' انجام نہیں دیے۔ گھر کی خبر لینے کے بجائے بیرونِ ملک وفود بھیجے جاتے ہیں۔ جماعت کی توجہ بھی باہر ہی زیادہ ہے۔ علما کی اس عدم توجہی کے سبب ہے کہ اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کی بنا پر ایک عورت کی غیر شرعی حکومت مسلط ہے۔ اس حکمران عورت کو برا بھلا کہنے سے کچھ حاصل نہیں' قصور ان عوام کا ہے جنھیں علما نے صحیح راہنمائی نہیں دی۔

علما کے فرائض کے بارہ میں چند گذارشات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہوں گا۔

پہلی بات یہ کہ علما بھی ایک زوال یافتہ معاشرہ کا حصہ ہیں۔ ان کے ادارے بھی ناقص ہیں۔ علمِ دین کے لیے جاتے بھی وہ لوگ ہیں جو کہیں اور نہیں جا سکتے۔ ظاہر ہے کہ وہ چمکتے دمکتے چراغ تو نہیں بن سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام میں اوّل تو "عالم" عیسائیوں میں پادری کے منصب کی طرح کوئی منصب نہیں' ایک مقام ہے۔ ہمارے ہاں تو ایک ہی منصب ہے' اور وہ رسول کا۔ یا پھر امیر اور حکمراں کا۔ قرآن و حدیث میں کوئی تعریف موجود نہیں کہ کون عالم ہے کون نہیں۔ اگر آپ کو یہ علم ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں' محمدؐ اس کے رسول ہیں' تو آپ عالم ہیں۔ بلکہ یہ تو سب سے بڑا علم ہے۔ اس کے ساتھ اگر آپ کو نماز روزہ کے مسائل معلوم ہیں' آپ کو معلوم ہے کہ اللہ سے سب سے بڑھ کر محبت کرنا چاہیے اور اس کے علاوہ کسی سے نہ ڈرنا چاہیے' اس کے علاوہ نفع نقصان کا مالک کوئی نہیں' قیامت کے دن اس سے ملاقات ہو گی اور ذرہ برابر نیکی اور بدی سامنے آجائے گی' اور جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی' سچائی' پاس عہد' امانت داری' فیاضی' ادائے حقوق اللہ کو محبوب ہیں' اور اس کے برعکس مغضوب --- تو یہ تو علمِ عظیم ہے۔ یہ علم ہر مسلمان کو حاصل ہے۔

آپ غور کریں تو اللہ تعالیٰ نے امربالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری علما پر کہیں بھی نہیں ڈالی' پوری امت پر ڈالی ہے۔ قرآن و سنت کی تعبیر کے لیے کوئی پوپ اور کالج آف کارڈینلز نہیں بنایا' بلکہ وحی کا امین و حامل ساری امت کو بنایا۔ اسی لیے اس نے امربالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے ہر مسلمان مرد اور عورت کو ذمہ دار اور مسئول ٹھہرایا۔ یہ بات' غزوہ تبوک کے سیاق میں' عالمی مشن کے آغاز کے وقت' واضح کر دی گئی: وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ ۹: ۷۱)' اس لیے صرف علما کو ذمہ دار نہ دنیا میں ٹھہرایا جا سکتا ہے' نہ آخرت میں۔ سورۃ الاحزاب' سورۃ سبا اور دیگر مقامات پر مذکور ہے کہ لوگ اپنے پیشواؤں اور رہنماؤں کو موردِ الزام ٹھہرائیں گے' لیکن ان کا عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔

بین الاقوامی تبلیغ کے بارہ میں آپ نے جو تحریر فرمایا ہے وہ کسی غلط فہمی پر مبنی محسوس ہوتا ہے۔ جماعت تو اپنی ساری مساعی پاکستان ہی پر مرکوز کیے ہوئے ہے۔ بری بھلی جیسی کچھ بھی وہ ہیں۔

عورت کی حکمرانی یقیناً غلط ہے' لیکن اس ملک کا مقدر عورت نہیں' ظالم اور جابر' جمہوری اور فوجی' آمر ہی رہے ہیں۔ وہ مرد تھے' وہی سارے بگاڑ کے ذمہ دار ہیں' انھی کے ماتحت سارے غیراسلامی کام دھڑلے سے ہوتے رہے۔ (خ - م)

کتاب نما

مولانا مودودیؒ کے خطوط : مرتبہ : سیّد امین الحسن رضوی۔ ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ صفحات ۱۰۲۔ قیمت ۱۰ روپے۔

اس وقت تک خطوطِ مودودیؒ کے چھوٹے بڑے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ مجلّہ ''تذکرہ سیّد مودودیؒ'' میں بھی ایک سو سے اوپر خط شامل ہیں۔ اس کے باوجود مختلف اصحاب کے پاس مولانا مرحوم کے غیر مطبوعہ خطوط بڑی تعداد میں موجود ہیں' اور رسائل میں بھی ان کی اتنی مقدار شائع ہو چکی ہے کہ انھیں مدون کرنے سے کئی مجموعے تیار ہو سکتے ہیں۔ (ترتیب و تدوین کا کچھ کام ہو بھی رہا ہے)۔

ہفت روزہ *Radiance* دہلی کے سابق مدیر سید امین الحسن رضوی کے نام ۱۹ مکاتیب کا زیر نظر مجموعہ اس سلسلے کی تازہ ترین کڑی ہے۔ ''عرضِ حال'' کے تحت چالیس صفحات میں انھوں نے مولاناؒ سے اپنے تعلقات' متعدد ملاقاتوں اور ان میں ہونے والی دلچسپ اور پر مغز گفتگوؤں کی روداد بیان کی ہے۔ یہ ایک طرح کی آپ بیتی ہے جس میں مصنف کے اپنے احوال و اسفار کے ساتھ (جس کی حیثیت پس منظر کی ہے) مولانا مودودیؒ کی دل نواز و دل کش شخصیت کی جھلکیاں موجود ہیں۔

رضوی صاحب کے مطابق بیشتر خط مختصر اور مولاناؒ کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہیں۔ (۱۹۵۲ کا خط ملک غلام علی صاحب کا تحریر کردہ ہے)۔ ان میں ''تفہیم القرآن'' کے ترجمے' انسانی کمزوریوں' عورت کی حکمرانی' حروفِ مقطعات اور بریلویت جیسے اہم موضوعات پر اظہارِ خیال ملتا ہے۔ دو تین مثالیں' جن سے مولانا مرحوم کے مخصوص اسلوب' ان کی حکیمانہ بصیرت اور انسانی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے :

میں ایک انسان ہوں' اور انسان ہر وقت معیاری کام کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اس کو

دوستوں اور خیر خواہوں کی مدد درکار ہوتی ہے کہ وہ معیار سے گرے تو وہ اسے متنبہ کر دیا کریں۔

○

آپ اطمینان رکھیں کہ سرِدست تو ہم برسراقتدار نہیں آ رہے ہیں لیکن اگر کبھی برسرِاقتدار آگئے تو ریڈیو سے صرف ان پروگراموں کو خارج کریں گے جو دین و اخلاق کے منافی ہیں۔ کرکٹ کمنٹری اس تعریف میں نہیں آتی۔

○

(۱۹۷۰ کے انتخابات سے تقریباً ۲۰ دن پہلے) آخری تنبیہہ کے طور پر' میں نے اسلام کے ان نام نہاد حامیوں کو' جنھوں نے مل کر جماعتِ اسلامی کو اپنا اصل ہدف بنا لیا تھا' خبردار کیا تھا کہ آپ جس حصار کو توڑنے پر اپنا سارا زور صرف کر رہے ہیں' یہ اگر ٹوٹ گیا تو الحاد و بے دینی' اشتراکیت اور صوبائی و لسانی تعصبات کے جو طوفان پاکستان کو تباہ کرنے کے لیے اٹھ رہے ہیں ان کو روکنا آپ میں سے کسی کے بس کا روگ نہ ہو گا' اور آخر میں آپ سب کو پچھتانا ہو گا۔

○

مولانا جلال الدین عمریؒ نے "پیش لفظ" میں مولاناؒ کے ان خطوط کو بجا طور پر "بے ساختگی و برجستگی کا بہترین نمونہ" قرار دیا ہے۔ "ان سے مولانا کا اخلاق' ان کا انکسار اور خاکساری' سیاسی بصیرت' جرات و ہمت اور پامردی اور استقامت' غرض ان کی زندگی کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں"۔

رضوی صاحب نے اپنی زندگی کے اس "سب سے بڑے سرمایے" کو جس عقیدت و محبت اور سلیقے کے ساتھ مدون کر کے پیش کیا ہے' اس کا تقاضا تھا اور مکتوب نگار کی شخصیت اور ان مکاتیب کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر بھی ان کے عکس شامل کتاب کرنا بہت مناسب' بلکہ ضروری تھا۔ اس سے مجموعے کی اہمیت دو چند ہو جاتی۔ موجودہ صورت میں یہ کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔ امید ہے مرتب و ناشر اشاعتِ دوم میں اس کی تلافی کر دیں گے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

اسلام ؟ : از شیخ علی طنطاوی' ترجمہ : سید شبیر احمد۔ ناشر: قرآن آسان تحریک "۱۳' اے ۲۔ ایجوکیشن ٹاؤن وحدت روڈ لاہور ۱۸۔ صفحات ۳۲۰۔ قیمت ۳۰ روپے۔

معروف عرب دانش ور اور عالم شیخ علی طنطاوی کی مقبول عام کتاب "تعریف عام بدین الاسلام" کا ترجمہ' قرآن آسان تحریک کے ناظم سید شبیر احمد نے "اسلام ؟" کے نام سے شائع کیا ہے۔ مترجم کے خیال میں یہ کتاب ایک "تحقیقی کارنامہ" ہے جس میں شیخ طنطاوی نے موجودہ دور کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے آسان اور سادہ زبان میں مکمل اسلام پیش کرنے کی سعی کی

ہے تاکہ :" ایک عام آدمی ایک ہی کتاب پڑھ کر کم از کم وقت میں اسلام کے بنیادی امور اور ضروریات دین سے واقف ہو جائے' اور اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکے"۔ سید صاحب مزید بتاتے ہیں کہ مصنف نے دین اسلام کے بارے میں عام انداز گفتگو سے ہٹ کر موجودہ دور کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر مسئلے کو عقل و درایت اور شعور و حکمت کے توسط سے پیش کیا ہے' اور جدید سائنسی انکشافات کے ذریعے دین فطرت کو برحق ثابت کیا ہے۔

عقائد و ایمانیات اسلام سے بحث کرنے والی اس کتاب کا اسلوب بھی جداگانہ ہے۔ مصنف نے اپنی بات کو عمومی انداز کے بجائے بانداز دگر کہنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے روزمرہ زندگی کے مشاہدات و واقعات سے مثالیں دینے کے ساتھ ساتھ متعدد فلسفیوں اور مفکروں (ڈیکارٹ' کانٹ' امام غزالی وغیرہ) کے حوالے بھی دیے ہیں' تاہم ان کے ہاں سب سے بڑا حوالہ قرآن حکیم کا ہے --- شیخ علی طنطاوی کی ہر بات اور ہر نکتے کے پس منظر میں کلام پاک اور اس کے ساتھ علوم اسلامیہ' نیز جدید مغربی علوم خصوصاً" فلسفہ و منطق اور نفسیات کا گہرا مطالعہ جھلکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بات کہنے کا سلیقہ دیا ہے اور وہ اپنا مفہوم عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ قاری تک موثر اور دل نشین انداز میں پہنچاتے اور اپنی بات کو قائل کر دینے والی مثالوں کی مدد سے واضح کرتے ہیں --- مثلاً : ایک جگہ اسلام اور مسلمان کے تعلق کو کس حسن و خوبی' اختصار و اجمال اور سادگی سے بیان کیا ہے :

> اسلام ہر وقت مسلمان کے ساتھ رہتا ہے' اور اسے بتاتا رہتا ہے کہ کیا چیز اس کے لیے مباح ہے اور کون سی حرام ہے۔ مسلمان خواہ تنہا ہو یا اپنے اہل خانہ کے ساتھ' تجارت کر رہا ہو یا کوئی اور کام' اسلام اس کا رہبر و رہنما ہے۔

شیخ علی طنطاوی نے اس کتاب کی تحریر و تالیف کی کہانی بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ میری چالیس کتابیں چھپ چکی ہیں جن کی ضخامت گیارہ ہزار صفحات سے زائد ہے لیکن میں اس بات پر بخوشی تیار ہوں کہ اپنے اس تمام علمی سرمائے سے دست بردار ہو جاؤں اور اللہ تعالیٰ اس کے بدلے مجھے اس کتاب کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے (خیال رہے کہ موجودہ کتاب مصنف کی موعودہ کتاب کا صرف ایک حصہ ہے)۔ اس سے خود مصنف کی نظر میں کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سید شبیر احمد صاحب عربی زبان کے عالم ہیں۔ انھوں نے ترجمہ اس عمدگی اور مہارت سے کیا ہے کہ ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ ایک مثال دیکھیے :

دوسرا راستہ ایک ہموار گزرگاہ ہے جس پر پھل دار درخت اور شگوفے سایہ فگن ہیں۔ دونوں جانب ہر قسم کی تفریحات جنت نگاہ اور فردوس گوش ہیں' جن کی وجہ سے دل کھنچا چلا جا رہا ہے لیکن راستے کے سرے پر ایک انتباہ آویزاں ہے کہ یہ راستہ انتہائی خطرناک اور مہلک ہے اور اس کے آخر میں ایک ایسا نشیب ہے' جس میں یقینی موت آپ کی منتظر ہے۔

ہمارے خیال میں زیرِ نظر کتاب کی اشاعت اردو کے دینی' اسلامی اور تبلیغی لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات: از سید جلال الدین عمری۔ ناشر: ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی' پان والی کوٹھی' دودھ پور' علی گڑھ۔ صفحات ۳۷۶۔ قیمت ۷۰ روپے۔

طب نبویؐ پر روایتی کتب سے مختلف اس کتاب میں صحت اور مرض کا وسیع تصور لے کر متعلقہ مسائل پر اسلامی تعلیمات دل نشین پیرائے میں بیان کی گئی ہیں۔ سید جلال الدین عمری کی یہ تحقیقی کاوش اپنے موضوع پر ایک منفرد پیش کش ہے جس میں آغاز میں جدید دنیا کے مسائل صحت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور پھر طہارت و نظافت' غذا' کھانے پینے کے آداب' ورزشیں' تفریحات اور مرض کے حوالے سے علاج کی شرعی حیثیت' خودکشی اور قطع حیات کی بحث' علاج میں محرمات کا استعمال' احکام میں مرض کی رعایت اور عیادت وغیرہ پر قرآن و حدیث اور اسلامی روایات کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ مصنف کے خیال میں بنیادی بات تو یہ ہے کہ اسلام جسم کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتا اور اس نے انسان کی روحانی ترقی کے ساتھ اس کی جسمانی صحت کو بھی مناسب اہمیت دی ہے۔ عمری صاحب کی اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ: "سوچنے سمجھنے کا زاویہ درست ہو تو جسمانی صحت و توانائی روحانی ترقی میں معاون ہوتی ہے اور باطن کے جلا میں اس سے مدد ملتی ہے"۔

اگرچہ یہ کتاب عام مطالعے کے لیے ہے اور اس اعتبار سے اپنے موضوع پر معلومات افزا اور دلچسپ ہے' تاہم مسلمان ڈاکٹروں اور طبیبوں کے لیے اس کی حیثیت خصوصی رہنما کی ہے۔ ہمارے ملک میں نصابات کی اسلامی تشکیل کے ضمن میں یہ گفتگو رہی ہے کہ ایم بی بی ایس وغیرہ کے لیے اسلامیات کا نصاب' روایتی انداز کے بجائے طلبہ کی پیشہ ورانہ ضروریات کے لحاظ سے مرتب کیا جانا چاہیے۔ تبصرہ نگار کی نظر میں یہ کتاب اس طرح کی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ (م - س)

بوسنیا کے مسلمان : از عبداللہ اسماچ' ترجمہ : اشفاق حسین۔ ناشر: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز' نصر چیمبرز' بلاک ۱۹' مرکز ایف سیون' اسلام آباد۔ صفحات ۱۹۴۔ قیمت ۶۰ روپے۔

یورپ کے خطہ بلقان میں مسلمان' صدیوں سے اپنی اجتماعی بقا و نشوونما کے لیے' غیر مسلموں اور بعض حکومتوں سے مسلسل نبرد آزما رہے ہیں۔ اس حوالے سے زیر نظر کتاب ایک طویل کشمکش' آزمایش اور صلیبیوں سے سخت جان مسلمانوں کی آویزش کی داستان ہے۔

دراصل یہ بوسنیا کے مسلمان سکالر اسماچ کی تحقیقی رپورٹ ہے جس میں یوگوسلاویہ کے خاتمے اور بلقانی مسلمانوں خصوصاً" بوسنیا کے مسئلے کے حقیقی پس منظر' مختلف اندرونی و بیرونی طاقتوں کے کردار' ان سے وابستہ مفادات اور خطے میں مسلمانوں کے ماضی' حال اور مستقبل سے متعلق مصدقہ ذرائع سے مہیا کردہ معلومات پیش کی گئی ہیں۔ مسئلہ بوسنیا کو کسی بھی پہلو سے لیجیے اور گفتگو کا سرا کہیں سے بھی پکڑیے' بڑی طاقتیں اور ایک حد تک خود اقوام متحدہ' بوسنیائی مسلمانوں کے خاتمے کے لیے سربیائی سازشوں اور کوششوں میں ایک فریق بنی نظر آتی ہے ----

جناب اسماچ نے ضروری اعداد و شمار' گوشواروں اور دستاویزی حقائق کی روشنی میں صورت حال واضح کر دی ہے۔ مزید برآں کتاب میں متعدد نقشوں کی مدد سے مختلف خطوں اور علاقوں کا سیاسی و جغرافیائی محل وقوع بھی دکھایا گیا ہے۔ بعض ادارے اور بڑی طاقتیں نام نہاد امن منصوبے اور تجاویز پیش کرتی رہی ہیں' مصنف نے ان پر بھی بحث کی ہے۔ اسماچ کا خیال بہت صائب ہے کہ بوسنیا کے مسئلے پر مغرب کے رویے کو صلیبی جنگوں کے حوالے سے دیکھنا چاہیے۔

کتاب کے آخر میں جون ۹۲ سے مئی ۹۳ تک بوسنیا کے بحران کا تاریخ وار خلاصہ (توقیت نامہ) دیا گیا ہے۔ ایک دوسرے ضمیمے سے یہ پتا چلتا ہے کہ آغاز جنگ سے ۱۰ ستمبر ۹۲ تک بوسنیا کی ۱۷۰۰ میں سے ۵۶۴ مساجد اور ۹۵۰ میں سے ۱۵۰ مدارس تباہ کیے جا چکے تھے۔ بیشتر مساجد اور مدارس کی حیثیت تاریخی تھی اور ان میں سیکڑوں نایاب اور قیمتی مخطوطات پر مشتمل متعدد کتب خانے بھی قائم تھے۔ انھیں باقاعدہ منصوبے کے تحت آگ لگا کر یا بمباری کر کے یا بارود لگا کر شہید اور مسمار کیا گیا۔ اس تفصیل سے علوم و فنون اور تہذیبی و ثقافتی ورثوں سے یورپ اور مسیحیوں کی دلچسپی ' اس باب میں ان کی "بے تعصبی اور وسیع الظرفی" کی حقیقت سامنے آتی ہے۔

بوسنیا کے مسئلے کو اس کے تاریخی پس منظر کے ساتھ سمجھنے کے لیے اس تحقیقی اور کارآمد رپورٹ کی حیثیت ایک چشم کشا آئینے کی ہے!

(رفیع الدین ہاشمی)

تصریحات: از سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ۔ مرتب سلیم منصور خالد۔ ناشر: البدر پبلی کیشنز، اردو بازار لاہور۔ طبع ششم ۱۹۹۴ (اضافوں کے ساتھ)۔ صفحات ۵۳۸۔ قیمت ۹۰ روپے۔

سید مودودیؒ اسلامی جمعیت طلبہ کے خاص مربی تھے۔ انھوں نے جمعیت کے چھوٹے بڑے اجتماعات میں وقتاً فوقتاً بیسیوں بین الاقوامی، سیاسی، معاشی، تعلیمی، معاشرتی اور تنظیمی امور و مسائل پر طلبہ سے خطاب کیا اور ان کے سوالوں کے جواب دیے جو عملی میدان میں کام کرنے والوں کے لیے بصیرت اور رہنمائی کا بے بہا خزینہ ہیں۔ سلیم منصور خالد نے سید مرحوم کی زندگی ہی میں ان کی تقریروں اور گفتگوؤں پر مشتمل زیر نظر مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اب اس کے نئے ایڈیشن میں کچھ نیا لوازمہ شامل کیا گیا ہے۔ "تصریحات" کا موضوعاتی تنوع قاری کے لیے دلچسپی کا باعث ہے اور نئی نسل کی رہنمائی کے لیے یہ ایک مفید اور موثر کتاب ہے۔ اس میں شامل مفصل اشاریے نے کتاب کی اہمیت کو دو چند کر دیا ہے۔

(رفیع الدین ہاشمی)

سارا جہاں ہمارا: از سلیم فاروقی۔ ناشر: اسمٰعیل میرٹھی اکیڈمی، محمدی کالونی ۸ - سی فیڈرل بی ایریا کراچی۔ صفحات ۱۴۲۔ قیمت ۶۰ روپے۔

بچوں کے لیے لکھنے کے رجحان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی ایک علامت اسکول کے بچوں کے لیے سلیم فاروقی کے یہ سات ڈرامے ہیں جو اسلامی تاریخ کے اہم واقعات و شخصیات، مثلاً: محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی، ٹیپو سلطان وغیرہ پر اس طرز پر لکھے گئے ہیں کہ انھیں اسکولوں میں اسٹیج بھی کیا جا سکے۔ ان ڈراموں کا مواد مستند اور تاریخی پس منظر حقیقی ہے اور کردار تاریخ کے مطابق ہیں۔

"یہ ڈرامے جذبہ ایمانی کی آبیاری کرنے والے ہیں۔ مسلمان آج جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں ضرورت ہے کہ ان کی نئی نسل کے جذبات کی تہذیب اس طرح کے ڈراموں سے ہو۔ سلیم فاروقی اس سے قبل بچوں کے لیے نظموں کے دو مجموعے بھی شائع کر چکے ہیں۔ (م - س)

مدیر کے نام

رحمت اللہ، کراچی

اگست ۹۴ کے "اشارات" سے آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی آزاد اور خود مختار ملک نہیں بلکہ شروع ہی سے غلام ہیں ۔

ابوبکر احمد، میر پور خاص

ہم موجودہ حکمرانوں کو برا بھلا کہتے ہیں "اشارات" پڑھ کر اندازہ ہوا کہ پاک امریکی تعلقات کی تو پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی گئی تھی۔

محمد عبداللہ، حسن ابدال

"اشارات" میں ہم جیسے عام قارئین کے لیے بہت سے باتیں بالکل نئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ پاکستان نے اپنے قیام کے ساتھ ہی امریکا کے آگے کاسہ گدائی پھیلا دیا۔ کیا آزاد اور خود دار قوموں کا یہی وطیرہ ہوتا ہے؟ اور پھر آگے چل کر خود کو امریکا کے ساتھ وابستہ ہی کر لیا' اور یہ وابستگی اب اتنی اندھی اور گہری ہو چکی ہے کہ ہم ہر معاملے میں امریکا ہی سے Dictation لیتے ہیں (میر بھی کیا سادہ ہیں ---)۔ "اشارات" سے یہ بھی پتا چلا کہ امریکا کس طرح ہمارا کھلا اور خفیہ "نگران" رہا ہے' لیکن جب ہم خود ہی اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہیں اور "امریکا' تیرا شکریہ" کی تختی گلے میں لٹکا لیں تو کسی سے شکوہ کیسا؟

عطاء محمد، راولپنڈی

پاکستان کو ایسی مخلص اور پرعزم قیادت کی ضرورت ہے جو ملک کو اس کا حقیقی باعزت مقام دلوا سکے۔ امریکا بھی جان لے کہ ہم آزاد ہیں۔

اقبال علی، واہ کینٹ

فقہی مسائل کے علاوہ تحریکی مسائل میں بھی اجتہاد آج کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ سوڈان میں حسن ترابی کی حکمت عملی (اگست ۹۴) اسی نوعیت کا اجتہاد ہے۔

شمیم احمد' کراچی

سوڈان میں فوج کے ساتھ تعاون بار آور ہوا ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک کی تحریکوں کو اس تجربے کو سامنے رکھنا چاہیے اور ممکن ہو تو کچھ سیکھنا بھی چاہیے۔

سیّد اشفاق احمد' حیدر آباد

فوج کے ساتھ تحریکِ اسلامی کے تعاون کو شجر ممنوعہ قرار دینے والوں کو عبدالوہاب آفندی کی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

محمد عبدالعزیز' پشاور

ہر فوج کی اپنی تربیت اور روایات ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ سوڈان کا تجربہ دوسری جگہ دہرایا جائے اور کامیاب ثابت ہو۔

سلیم منصور' گوجرانوالہ

"اشارات" حقیقی معنوں میں کوزے میں دریا بند تھا۔ ۴۷ سالوں پر پھیلے ہوئے تعلقات کے جوار بھاٹا کو اس خوبصورتی سے اور رواں دواں انداز سے اتنے تھوڑے صفحات میں پیش کرنے اور ساتھ ہی ان پر محاکمہ پیش کرنے سے ایک شاندار قلم پارہ تخلیق ہوا' اس پر مبارک باد قبول فرمائیے۔ لیکن ایک دو باتیں اور بھی ہیں۔

ایک جگہ آپ نے لفظ "یارِ غار" منفی حوالے سے لکھا۔ اردو ادب میں سیکولر بلکہ دین کا مذاق اڑانے والے الفاظ یا تراکیب میں سے یہ ایک لفظ ہے۔ مثال کے طور پر وحشت و درندگی کے لفظ "بربریت" کا استعمال بھی غلط ہے' سادھو سنتوں کا رول ادا کرنے والے کے لیے "اللہ ہو کے گنبد میں بند" کا محاورہ بھی نامناسب ہے' غلط معنوں میں لفظ "چار یاری" بھی مذموم ہے۔ ایسے اور بھی الفاظ ہیں جو بہرحال تاریخی اشارے بنتے ہیں' ان سے بچنا اور بچانا اشد ضروری ہے۔ انھی اشارات میں تشخیص اور تاریخی جائزہ تو بہت خوب تھا' لیکن "پس چہ باید کرد" میں قلیل المیعاد اور طویل المیعاد اہداف میں تشنگی محسوس ہوئی۔

اخونزادہ عبدالمتین' ژوب

ایک عام تعلیم یافتہ شخص کے لیے آپ کے رسالے کی زبان خاصی مشکل ہوتی ہے۔ اب ہم ڈکشنری ساتھ رکھ کر پڑھتے تو رہے۔ کلامِ نبویؐ بہترین سلسلہ ہے۔ صفحات بھی زیادہ کریں' اور تشریح بھی۔

REGD. NO. L 5340

PHONE : 7234014 7236665

MONTHLY TARJUMAN-UL-QURAN LAHORE